سلسلہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۱۷

نظامِ زندگی

حصّہ دوم

از افاداتِ

سرکار سید العلماء علامہ علی نقی النقوی مدظلہ العالی
مجتہد العصر

قیمت ۱۲ ار

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور نمبر ۱۷

نظامِ زندگی

حصہ دوم

از قلم حقیقت رقم

سرکار سید ... علی نقی النقوی مجتہد العصر

نظام زندگی میں تقلیدی عنصر

تقلید کے متعلق اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہے بہت سے افراد اس کو پیری مرید ...

خادم دین ...

سکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ ...

اردو بازار ... جون ...

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

کے مفید سلسلہ مطبوعات کا رسالہ نمبر ۱ نظام زندگی حصہ دوم آپ کے ہاتھوں میں ہے اسکا حصہ اول زیر نمبر ۱۱ اشاعت پذیر ہو کر جمہور سے سند قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

کسی مذہب کو تسلیم و قبول کر لینے کے بعد انسان کا فرض اولین بس یہ رہ جاتا ہے کہ وہ اس مذہب کے پیش کردہ نظام نامہ زندگی سے واقفیت حاصل کرے جس پر عمل کرنا ہی انسان کے قبول مذہب کی دلیل ہے اسلام کے پیش کردہ نظام زندگی کو مجتہد زمانہ مفکر اسلام سرکار سید العلماء علامہ علی نقی النقوی نے مختصر چار جلدوں میں مرتب فرمایا ہے جس کو امامیہ مشن لکھنؤ نے شائع کیا۔ زیر نظر کتابچہ اس کے حصہ دوم کا پاکستانی ایڈیشن ہے جس میں سرکار ممدوح مدظلہ العالی نے حقیقت عبادت، فلسفہ تقلید، طہارت و نجاست، پیش نمازی اور مواعظ و مجالس کی اجرت وغیرہ پر حکیمانہ انداز سے تبصرہ فرماتے ہوئے احکام کو عقل کی روشنی میں دیکھنے کا سامان فراہم کر دیا ہے۔

اہل بیت اطہار کے مقدس دامن سے وابستگی کا امتیازی نشان ذوق طہارت ہے جو تمام عبادات کی شرط اول اور روحانی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ مگر افسوس کہ بہت گھرانوں میں اس اہم ترین عمل سے غفلت خبر مانہ برتی جاتی ہے۔ لہذا مخلصانہ التماس ہے کہ تقلید و طہارت کی طرف کماحقہٗ توجہ فرمائیں تاکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی زیادہ کامیاب ہو۔

افراد ملت سے قوی امید ہے کہ نظام زندگی حصہ اول کی طرح حصہ دوم کا بھی پرجوش خیر مقدم فرماتے ہوئے توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے تاکہ باقی دو حصص بھی جلد شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو سکے۔

فقط والسلام

خادم دین سید حسن علی شاہ کاظمی

سکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ لاہور

اردو بازار۔ جون سنہ ۱۹۵۶
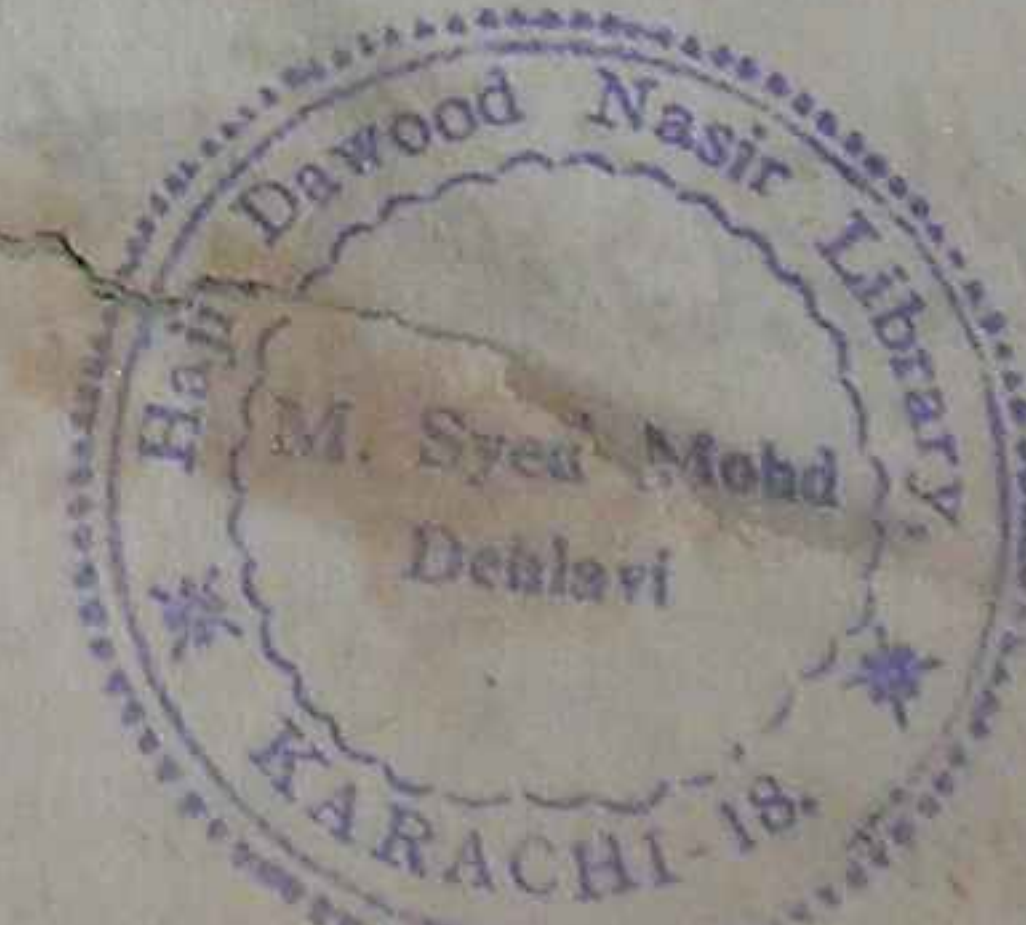
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین ۔ والصلوٰۃ علیٰ نبیہ خاتم النبیین وآلہ الطاہرین

انسان کے عملی فرائض

عقائد کے استحکام کا نمایاں نتیجہ اعمال و افعال میں ذمہ داری کا احساس ہے۔ بلوغ کے ساتھ ہی انسان پر یہ ذمہ داری سختی کے ساتھ عائد ہو گئی۔ شرع کے لحاظ سے یہاں تک آزاد تھا۔ اب مقید ہو گیا اب اس کی ہر حرکت و سکون جنبش لب اور گردش نگاہ موقف حساب میں ہے قلم تکلیف جاری ہو گیا ہے اور فرائض و اعمال کی سختی کے ساتھ نگرانی ہونے لگی ہے

اب سب سے پہلے جو نماز کا وقت آئے گا اس میں اس کو واجبی طور پر نماز ادا کرنا ہوگی اور نماز کے لئے صحیح طور پر طہارت لازمی ہوگی جس کے لئے بعض صورتوں میں غسل درکار ہوگا اور بعض صورتوں میں وضو لازم ہوگا بہت آسان تھا اگر نماز و طہارت کے تمام مسائل ہر حیثیت سے معین ہوتے اور ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ یہ کوئی کتاب اٹھا لیتا اور جو کچھ اس میں لکھا ہوتا اس پر عمل کرتا مگر دشواری یہ ہے کہ مسائل میں اختلاف ہے اور مختلف علمائے فقہ آپس میں جداگانہ ہیں۔ پھر اب یہ کیا کرے۔ کیونکہ عمل کرنے کیلئے تقلید کی ضرورت ہے

نظام زندگی میں تقلید کی ضرورت

تقلید کے متعلق اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہے بہت سے افراد اس کو پیری مریدی کی ایک

چیز سمجھتے ہیں اور بعض اُس کو ایک بلاضرورت سی شے خیال کرتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بالکل فطری شے ہے جو دنیا کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے اور کوئی چیز اُس سے مستثنٰی نہیں ہے یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص ہر فن سے واقف نہیں ہو سکتا ہر چیز میں کچھ اُس کے واقف کار ہوتے ہیں اور کچھ ناواقف۔ کوئی شبہہ نہیں کہ ناواقف افراد ہمیشہ ضرورت کے وقت پر واقف کار لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ کا خدانخواستہ کوئی عزیز بیمار ہے اگر آپ خود طبیب ہیں تو بسا اوقات خود علاج کریں گے، لیکن اگر طبیب نہیں ہیں تو ضرور کسی حکیم، ڈاکٹر کے پاس بھاگے جائیں گے اُس سے حال کہیں گے، وہ تشخیص مرض کرے گا۔ دوا تجویز کرے گا آپ اُس کے نسخہ پر عمل فرمائیں گے وہ دوا لائیں گے اور مریض کو پلائیں گے یہ تقلید نہیں تو کیا ہے آپ کو کوئی مکان بنوانا ہو۔ انجینیر کے پاس جائیں گے۔ اپنی ضروریات اُس سے بیان کریں گے وہ نقشہ بنائے گا۔ مصارف کا تخمینہ کرے گا۔ آپ اُسی کے مطابق عمل کریں گے، یہ تقلید ہی تو ہے۔

آپ کا کوئی مقدمہ درپیش ہوتا ہے، وکیل یا بیرسٹر کے پاس مسل لے جاتے ہیں مقدمہ کی روئداد سناتے ہیں وہ اُس کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا ہے آپ اُسی کی رائے کے مطابق کاغذات داخل کرتے ہیں گواہ تیار کرتے ہیں۔ اور مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں یہ سوائے تقلید کے کچھ اور نہیں ہے۔

یہی صورت ہر چیز میں ہے۔ پھر جس قدر کسی معاملہ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی اُس میں سوجھ بوجھ اور انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے اگر کوئی معمولی مرض ہے۔ تو جو حکیم بھی اُس وقت سر دست موجود ہوا اُسی کی طرف رجوع کر کے نسخہ لکھوا لیا، لیکن گو مرض پیچیدہ ہے تو کوشش ہوتی ہے کہ جو سب سے بڑا حکیم یا ڈاکٹر ہو اُس سے علاج کرایا جائے

یوں ہی چھوٹا سا مکان بنوانا ہے تو کسی معمولی نقشہ نویس سے نقشہ مرتب کرا لیں گے لیکن اگر کوئی عالی شان کوٹھی بنوانا ہو تو بڑے انجینیر کی تلاش ہو گی۔ کوئی مقدمہ بالکل معمولی دس پانچ روپیہ کا ہے تو کسی معمولی وکیل سے رجوع کر لیں گے لیکن اگر بڑا مقدمہ ہے تو پھر فکر ہو گی کہ سب سے بڑے وکیل کی طرف رجوع کی جائے حالانکہ غلطی کا امکان اُس بڑے حکیم کامل انجینیر اور وکیل میں بھی ہے اور اس لیے کبھی اُن کے کبھی ان کے ہاتھوں میں ناکامیابی ہوتی ہے مگر عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کوتاہی نہ ہونا چاہیئے اس کے بعد بھی اگر مضرت واقع ہوئی تو وہ قسمت سے متعلق ہے، انسان کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔

اب دیکھئے کہ احکام شرعیہ، یہ وہ چیز ہے جس سے انسان کی دین و دنیا دونوں وابستہ ہیں اگر ہر شخص اتنا علم رکھتا ہوتا کہ خود تحقیق کرکے اور سمجھ کر رائے قائم کرے تو بے شک تقلید کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص مجتہد ہوتا اور ضرورت نہ تھی کہ وہ دوسرے کی رائے پر عمل کرے مگر عام نظام دنیا کی بنا پر یہ امر غیر ممکن ہے اور نہ شرع میں اُس کا حکم ہے۔ کتنی ہی علمی ترقی ہو جائے پھر بھی دو طبقے رہنا ضروری ہیں۔ ایک صاحبان علم جو مسائل دینیہ کو خود سمجھ سکتے ہیں دوسرے ناواقف عوام یعنی جہال، اب یہ جاہل افراد کیا کریں؟ کیا احکام شرعیہ سے ان کو بالکل بے نیاز سمجھ لیا جائے اور انہیں بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا جائے! پھر جب یہ صحیح نہیں تو سوائے اس کے اور کیا صورت ہے کہ ناواقف لوگ واقف کار افراد سے رجوع کریں اور اُن سے دریافت کرکے مسائل پر عمل کریں۔ اسی کا نام تقلید ہے۔

چیز سمجھتے ہیں اور بعض اُس کو ایک بلاضرورت سی شے خیال کرتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بالکل فطری شے ہے جو دنیا کے ہر شعبہ میں کار فرما ہے اور کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں ہے یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص ہر فن سے واقف نہیں ہو سکتا ہر چیز میں کچھ اُس کے واقف کار ہوتے ہیں اور کچھ ناواقف۔ کوئی شبہہ نہیں کہ ناواقف افراد ہمیشہ ضرورت کے وقت پر واقف کار لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ کا خدا نخواستہ کوئی عزیز بیمار ہے اگر آپ خود طبیب ہیں تو بسا اوقات خود علاج کریں گے، لیکن اگر طبیب نہیں ہیں تو ضرور کسی حکیم، ڈاکٹر کے پاس جائیں گے اُس سے حال کہیں گے، وہ تشخیص مرض کرے گا۔ دوا تجویز کرے گا آپ اُس کے نسخہ پر عمل فرمائیں گے وہ دوا لائیں گے اور مریض کو پلائیں گے یہ تقلید نہیں تو کیا ہے آپ کو کوئی مکان بنوانا ہو۔ انجینیر کے پاس جائیں گے۔ اپنے ضروریات اُس سے بیان کریں گے وہ نقشہ بنائے گا۔ مصارف کا تخمینہ کرے گا۔ آپ اُسی کے مطابق عمل کریں گے، یہ تقلید ہی تو ہے۔

آپ کا کوئی مقدمہ درپیش ہوتا ہے، وکیل یا بیرسٹر کے پاس مسل لے جاتے ہیں مقدمہ کی روئداد سناتے ہیں وہ اُس کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا ہے آپ اُسی کی رائے کے مطابق کاغذات داخل کرتے ہیں گواہ تیار کرتے ہیں۔ اور مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ سوائے تقلید کے کچھ اور نہیں ہے۔

یہی صورت ہر چیز میں ہے۔ پھر جس قدر کسی معاملہ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی اُس میں سوجھ بوجھ اور انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے اگر کوئی معمولی مرض ہے۔ تو جو حکیم بھی اُس وقت سردست موجود ہوا اُسی کی طرف رجوع کر کے نسخہ لکھوا لیا، لیکن گر مرض پیچیدہ ہے تو کوشش ہوتی ہے کہ جو سب سے بڑا حکیم یا ڈاکٹر ہو اُس سے علاج کرایا جائے

یوں ہی چھوٹا سا مکان بنوانا ہے تو کسی معمولی نقشہ نویس سے نقشہ مرتب کرالیں گے لیکن اگر کوئی عالی شان کوٹھی بنوانا ہو تو بڑے انجینیر کی تلاش ہوگی۔ کوئی مقدمہ بالکل معمولی دس پانچ روپیہ کا ہے تو کسی معمولی وکیل سے رجوع کر لیں گے لیکن اگر بڑا مقدمہ ہے تو پھر فکر ہوگی کہ سب سے بڑے وکیل کی طرف رجوع کی جائے حالانکہ غلطی کا امکان اُس بڑے حکیم کامل انجینیر اور وکیل میں بھی ہے اور اس لیے کبھی اُن کے کبھی ان کے ہاتھوں میں ناکامیابی ہوتی ہے مگر عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کوتاہی نہ ہونا چاہیے اس کے بعد بھی اگر مضرت واقع ہوئی تو وہ قسمت سے متعلق ہے، انسان کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔

اب دیکھئے کہ احکام شرعیہ، یہ وہ چیز ہے جس سے انسان کی دین و دنیا دونوں وابستہ ہیں اگر ہر شخص اتنا علم رکھتا ہوتا کہ خود تحقیق کرکے اور سمجھ کر رائے قائم کرے تو بے شک تقلید کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص مجتہد ہوتا اور ضرورت نہ تھی کہ وہ دوسرے کی رائے پر عمل کرے مگر عام نظام دنیا کی بنا، پر یہ امر غیر ممکن ہے اور نہ شرع میں اُس کا حکم ہے۔ کتنی ہی علمی ترقی ہو جائے پھر بھی دو طبقے رہنا ضروری ہیں۔ ایک صاحبان علم جو مسائل دینیہ کو خود سمجھ سکتے ہیں دوسرے ناواقف عوام یعنی جہال، اب یہ جاہل افراد کیا کریں، کیا احکام شرعیہ سے ان کو بالکل بے نیاز سمجھ لیا جائے اور انہیں بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا جائے! پھر جب یہ صحیح نہیں تو سوائے اس کے اور کیا صورت ہے کہ ناواقف لوگ واقف کار افراد سے رجوع کریں اور اُن سے دریافت کے مسائل پر عمل کریں۔ اسی کا نام تقلید ہے۔

زمانہ ائمہ میں نظامِ تقلید کا وجود

یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ زمانہ ائمہ علیہم السلام میں بھی موجود تھی یہ ظاہر ہے کہ امام کا قیام کسی ایک مرکز پر رہتا تھا اسلام اور تشیع کا دائرہ بہت وسیع تھا اور دُور دُور دراز کے لوگ احکامِ شرعیہ پر عمل کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ہر ایک کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ امام کی خدمت میں حاضر ہو کر براہ راست مسائل کو دریافت کرے اور علمِ شریعت کو حاصل کرے بلکہ کچھ افراد ایسے ہوتے تھے جو امام سے مسائل دینیہ کا علم حاصل کریں اور اُسے دوسرے ناواقف افراد تک پہونچائیں۔ ظاہر ہے کہ احادیثِ ائمہ میں عمومات ہوتے تھے تخصیصات، مطلقات ہوتے تھے اور تقییدات، حقائق ہوتے تھے اور مجازات عوام کو چاہیئے وہ اہل عرب ہی کیوں نہ ہوں، ہرگز اس کا موقع نہیں ہے کہ وہ کسی حدیث کو سن کر آنکھ بند کر کے اُس کے مفہوم پر عمل کریں، وہ اصحاب میں سے علمائے شریعت ہی تھے کہ جو احادیث سے معنی اخذ کر کے نتیجہ یعنی احکامِ شرعیہ سے جہال کو واقف بناتے تھے۔ یہ وہی اجتہاد و تقلید ہے جس کا آج سوال درپیش ہے خود دارایانِ حدیث میں سے سب ایسے نہیں تھے جو ہمیشہ اپنے ذاتی علم پر عمل کریں اس لئے کہ بعض راوی تو ایسے ہیں جنھیں اتفاق سے کبھی ایک ہی مرتبہ پیش آیا خدمتِ امام میں حاضر ہونے کا اور اُس وقت کی کوئی بات انھوں نے نقل کردی، لیکن وہ رواۃ جو بہت زیادہ خصوصیت رکھتے تھے وہ بھی ہر موقع پر موجود نہیں رہتے تھے۔ امام کا سلسلۂ فیض برابر جاری تھا یقیناً بہت سے مسائل حضرت اُن کی غیبت میں بیان فرماتے تھے، ان مسائل کی معرفت کا ذریعہ اُن رواۃ کیلئے جو اس وقت موجود نہ تھے اُن رواۃ کا بیان ہی ہو سکتا ہے جو اتفاق سے اس موقع

پر حاضر تھے پھر یہ ظاہر ہے کہ نقل الفاظ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لیے بڑے حافظہ کی ضرورت ہے۔ حقیقتہً نقل بالمعنی ہی ہے جس کے ذریعہ سے روایات منتشر ہوتے ہیں۔ یہ نقل بالمعنی ظاہر ہے کہ خود راوی کے فہم و استنباط پر مبنی ہے اور جو کچھ وہ سمجھتا ہے اُسی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ سو وہ دوسرے بزرگ جو اس روایت کو سن کر عمل کرتے ہیں وہ اس کے فہم و استنباط پر اعتماد ہی تو کرتے ہیں یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے۔

قرآنی ثبوت

خود قرآن مجید میں مسائل دینیہ کے علم کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ یہی ہے ارشاد ہوتا ہے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ کیوں نہیں ان میں سے ہر جماعت میں سے ایک گروہ سفر کرتا تاکہ وہ مسائل دینیہ کو سمجھیں اور واپس آنے کے بعد اپنی قوم کو ڈرائیں یعنی فرائض شرعیہ پر متنبہ کریں شاید کہ وہ ڈریں یعنی فرائض پر عمل پیرا ہو جائیں۔

یہاں اُن لوگوں کیلئے جو دور دراز مقامات پر رہتے ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو سفر کرنا چاہیئے تاکہ وہ مسائل دینیہ کو حاصل کریں۔ یہاں لِيَسْمَعُوا نہیں ہے جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ احادیث کو سنیں اور اس کا تعلق اور اس کا تعلق پھر صرف روایت اختیار سے ہوتا بلکہ لِيَتَفَقَّهُوا کی لفظ ہے یعنی سمجھیں۔ اس کا تعلق معانی سے ہے اور اُن کا سمجھنا استنباط ہے۔ پھر

جب وہ واپس جاتے ہیں تو انہی احکام کو اپنی قوم تک پہونچاتے ہیں اگر ان کے بتائے ہوئے احکام پر دوسروں کو عمل کرنا درست نہ ہو تو اس پہونچانے کا کوئی حاصل ہی نہیں ہے پھر صراحت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ وہ لوگ ڈریں یعنی ان کے بیانات سے متاثر ہوں اس کا عملی نتیجہ صرف یہ ہے کہ وہ ان احکام و فرائض کو بجالانے لگیں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

احادیث

احادیث میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ ابان بن تغلب سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا ہے یَا اَبَانُ اِجْلِسْ فِیْ مَسْجِدِ الْمَدِیْنَةِ وَافْتِ النَّاسِ فَاِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ یُّرٰی فِیْ شِیْعَتِیْ مِثْلُکَ "اے ابان مسجد مدینہ میں بیٹھا کرو اور فتوے دیا کرو کیونکہ مجھے پسند ہے کہ میرے شیعوں میں تمہارے ایسے لوگ دکھلائی دیں"

یونس بن عبدالرحمن کی طرف مسائل دینیہ میں رجوع کا حکم دیا۔

یہ وہی اجتہاد و تقلید کا نظام ہے جو اس وقت قائم ہے یہی اُس وقت بھی قائم تھا بے شک اُس وقت اجتہاد آسان تھا اس لئے کہ ائمہ معصومین موجود تھے اور زیادہ شبہات توہمات کے پردے حائل نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت اجتہاد زیادہ مشکل ہو گیا ہے کیونکہ اختلافات کی کثرت، شبہات کی فراوانی اور عہد ائمہ سے بعد ہو گیا ہے لیکن اس سے حقیقت اجتہاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ تقلید کے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

مرکز تقلید کا انتخاب

جس قدر کسی معاملہ کی اہمیت زیادہ ہو گی اُسی قدر اُس کے متعلق اہتمام زیادہ ضروری ہو گا۔

تقلید کا تعلق مسائل دینیہ کے ساتھ ہے جس پر انسان کی معاش و معاد کا انحصار ہے اس لئے تقلید کے بارے میں یہ نہیں ہو سکتا کہ آنکھ بند کر کے جس کی چاہے تقلید کر لی جائے بلکہ ضرورت ہے کہ اس میں وقت نظر اور انتخاب سے کام لیا جائے۔

بعض لوگ تو اس میں اعلمیت کی شرط ضروری سمجھتے ہیں یعنی تقلید اُس شخص کی کرنا ضروری ہے جو تمام افراد اہل علم میں سب سے زیادہ صائب الرائے ہو مگر میرے نزدیک اعلم کی تشخیص انتہائی دشوار بلکہ غیر ممکن ہے۔ دشوار تو اس حیثیت سے ہے کہ اگر علماء کسی ایک شہر، ایک صوبہ یا ایک ملک میں منحصر ہوتے تو پھر بھی آسان تھا کہ ان سب کے مبلغ علم سمجھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ اعلم کون ہے لیکن ایسے زمانہ میں جبکہ علمی دائرہ وسیع ہو چکا ہے اور مختلف ممالک میں علماء موجود ہیں ان سب کے اندر ایک اعلم کی تشخیص کرنا بہت دشوار ہے اور ناممکن ہیں اس اعتبار سے کہتا ہوں کہ اعلم کی تشخیص کرنے والے عوام ہونگے یا مجتہدین ظاہر ہے کہ عوام تو تشخیص اعلم کر نہیں سکتے اسکو اگر سمجھ سکتے ہیں تو مجتہدین، مگو چونکہ اعلمیت کا دارومدار کثرت محفوظات یا وسعت نظر وغیرہ پر نہیں ہے بلکہ اصابت رائے پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مجتہد ہر ایک خود مسائل شرعیہ میں کچھ نہ کچھ لفظہ نظر رکھتا ہو گا اور وہ نقطہ حقیقت اُسی کو سمجھتا ہو گا جو اُس کی رائے کے موافق ہے اس لئے وہ سب سے

زیادہ صائب الرائے اُس شخص کو خیال کرے گا جس کی رائے زیادہ مسائل میں
اس کے نزدیک صحیح ہے یعنی خود اس کی رائے کے موافق ہے۔ لیکن اس
سے واقعی اعلمیت کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ غور کرنے پر ایک اور راز کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ اعلمیت
کا اثر جہاں تک ظاہر ہوتا ہے وہ اُن مسائل میں کہ جہاں اعلم اور غیر اعلم میں اختلاف
ہو۔ لیکن ہر مجتہد جبکہ وہ خود صاحب رائے ہے یعنی ہر مسئلہ میں کچھ نہ کچھ اپنے مقام پر
طے کئے ہوئے ہے تو وہ نقطہ حقیقت اُسی کو سمجھے گا جو خود اُس کی رائے ہے
اور اس کے علاوہ جو بھی ہو اُسے وہ خلاف واقع خیال کرے گا۔ یہاں تک کہ کسی
بڑی سے بڑی ہستی کے فتوے کا اس کے سامنے ذکر کیا جائے تو وہ کہدے گا کہ
اس مسئلہ میں اُن سے تسامحہ ہوا ہے یعنی اُن کی رائے صحیح نہیں ہے۔ نتیجہ کیا نکلا کہ اُن
تمام مسائل میں جہاں اس سے اور کسی دوسرے مجتہد سے اختلاف ہے وہ حکم واقعی
اُسی کو سمجھتا ہے جو اُس کی رائے ہے اور اس کے خلاف جس کا بھی فتویٰ ہو اُسے
صحیح نہیں سمجھتا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مجتہد چاہے وہ زبان سے نہ کہے لیکن اپنے
مقام پر اپنے ہی تئیں زیادہ صائب الرائے خیال کرتا ہے جو اعلمیت کا معیار ہے
یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص تکلف سے اپنی اعلمیت کا دعویٰ نہ کرے لیکن
اُس کے مجتہد ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف کسی رائے کو صحیح نہیں
سمجھے گا پھر کسی دوسرے کی اعلمیت کے کیا معنی باقی رہتے ہیں۔

تقلید کے لئے میرے نزدیک ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی واقفیت اور
اور دسترس کے حدود میں جس کے علم و عمل یعنی اجتہاد اور ورع و تقویٰ پر سب سے

زیادہ اطمینان ہو اُس کی تقلید کی جائے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں یہی صورت ہے طبیب کی تلاش ہوگی تو ایسے کی جو فن طب
میں مہارت رکھتا ہو۔ یہ علم ہے اور مریضوں کی طرف بے توجہی نہ کرتا ہو، ذاتی جذبات
کی بنا پر اس میں خرابی نہ ڈالتا ہو۔ یہ عمل ہے۔ مقدمہ کے لئے وکیل یا بیرسٹر کی ضرورت
ہوتی ہے تو ایسے کی جو قانونی مہارت رکھتا ہو۔ یہ علم ہے اور رشوت لے کر فریق مخالف
سے مل نہ جاتا ہو۔ یہ عمل ہے۔ تقلید مسائل دینیہ سے متعلق ہے اس لئے ضرورت
ہے کہ وہ شخص عالم ہو یعنی قوت اجتہاد رکھتا ہو اور اس کے ساتھ عادل ہو یعنی اپنے
فرائض کا پورا احساس رکھتا ہو۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ ذاتی اغراض کی بنا پر احکام دینیہ
میں تغیر و تبدیلی کر دے۔ راحت طلبی اور تن آسانی سے کام لے اور غور و فکر اور بحث
و جستجو میں کوتاہی کرے، اس لئے مسائل غلط بتائے۔ کسی وقت مسئلہ معلوم نہ ہو یا ابھی اس
میں غور نہ کیا ہو تو صاف صاف یہ کہدینا کہ مجھے اس وقت یہ مسئلہ پیش نظر نہیں ہے اپنی
شان و عظمت کے خلاف سمجھے، اس لئے اٹکل پر جواب دیدے اور کچھ نہ کچھ بتلا دے تاکہ اس
کی ناواقفیت کا پردہ چاک نہ ہو اور عوام اُسے عالم متبحر سمجھ لیں۔ بعض وقت نخوت پروری
سے کام لے اور جو بات منہ سے نکل گئی چاہے بعد کو اُس کی غلطی کا احساس بھی ہو پھر بھی
پہلی بات پر قائم رہے اور صحیح رائے کا اظہار نہ کرے۔ ایسا شخص ہرگز قابل تقلید نہیں
ہے۔ ضرورت ہے اس امر کی کہ اُسے اپنے فرائض کی اہمیت کا صحیح احساس ہو وہ واجبات
اور محرمات کے بارے میں سختی سے پابند ہو اس کے ساتھ تحقیق مسائل میں جد و جہد
سے کام لیتا ہو اغراض شخصیہ کو مسائل دینیہ میں دخل نہ دیتا ہو اور انانیت یا نخوت پروری
سے کبھی اصل حقیقت کے اظہار میں توقف نہ کرتا ہو ایسا شخص قابل تقلید ہے۔ ان

ہی باتوں کے تحفظ کے لئے عدالت کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے۔

عدالت

"عدالت" ایک باطنی چیز ہے جس کو "خوف خدا" "احساس فرائض" اور "جذبہ" طاقت سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن وہ چونکہ دیکھنے کے قابل چیز نہیں اس لئے اس کے سمجھنے کا ذریعہ آثار ظاہری یعنی افعال ہی ہو سکتے ہیں۔ کسی انسان کا عملی طور سے پابند شریعت ہونا کہ وہ واجبات کو ادا کرتا ہے۔ محرمات سے پرہیز کرتا ہے، اسی سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ عدالت کی صفت سے متصف ہے۔ اب یہ امر کہ وہ کہاں تک پابند شریعت ہے اس کے سمجھنے کی ایک صورت تو معاشرت ہے یعنی آپ ایک عرصہ دراز تک کسی کے ساتھ رہے ہیں اُس کے تمام و کمال حالات سے مطلع ہیں، اور آپ نے اتنے طویل عرصہ کی معاشرت میں یہ اندازہ کیا ہے کہ اُس میں احساس فرائض کافی طور پر موجود ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دو شخص جن کی عدالت کو آپ اسی صورت پر سمجھ چکے ہوں وہ کسی شخص کی عدالت کی گواہی دیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کے متعلق کثرت سے لوگ اچھے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور عموماً اُس کے ورع و تقویٰ کا اعتراف کیا جاتا ہو جس سے انسان کو اُس کے متعلق اطمینان پیدا ہو جائے۔

یہ وہ صورتیں ہیں جن سے کسی شخص کی عدالت ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ طریقہ کار کہ ہم کسی خاندان کے مقلد ہیں لہذا اس خاندان میں جو بھی فرد ہو اُسی کی تقلید کریں گے یا یہ کہ ہمارے بزرگ کسی کے مقلد تھے لہذا ہمیں بھی اُسی کی تقلید کرنا چاہئے

ہرگز درست نہیں ہے۔ نہ کمال علمی میراث ہے جو خاندان میں تقسیم ہوتی ہو اور نہ ورع و تقویٰ متروکہ ہے جو ایک سے دوسرے کی جانب منتقل ہوتا ہو اور باپ دادا کے طرز عمل کی پیروی بھی نجات کی ذمہ دار نہیں ہے۔

یہ انسان کے دین و دنیا کی فلاح کا مرحلہ ہے اس میں اُسے خود اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیئے۔

تقلید کی عملی حیثیت

تقلید کے معنی ہیں کسی مجتہد سے احکام مذہبی کو حاصل کر کے اُن پر عمل کرنا اس کے لیے نہ کسی فہرست میں نام درج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ مجتہد کو اطلاع دینے کی کہ میں آپ کا مقلد ہوتا ہوں۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے یہاں عوام کے طبقہ میں تقلید ایک رسمی چیز سمجھ لی گئی ہے کسی مجتہد سے کہا یا تحریر لکھ کر بھیجی کہ ہم آپ کے مقلد ہوتے ہیں۔ بس اب وہ اُن کے مقلد ہو گئے پھر کبھی مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور نہ اُس کے فتاوے سے واقفیت ہی حاصل کی جاتی ہے۔

اُس تقلید کے نتائج دوسری صورتوں سے ظاہر ہوتے ہیں خدانخواستہ کسی عزیز کا انتقال ہو جائے گا تو تقلید یاد آئے گی۔ ہم فلاں مجتہد صاحب کے مقلد ہیں اس لئے نماز جنازہ وہی پڑھائیں گے ماشاء اللہ عقد نکاح کی تقریب ہو گی تو عقد پڑھوانے کے لئے اُن مجتہد صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے گا اور اپنی تقلید کا واسطہ دیا جائے

گا بچہ کے ختنے میں دعا پڑھوانا۔ ضرورت کے وقت استخارہ دکھلوانا، یہ وہ فرائض ہیں جو مجتہد ہی
کے سمجھ لیئے گئے ہیں۔

حالانکہ یہ وہ باتیں ہیں جن میں مجتہد کی ضرورت نہیں ہے بغیر اس کے بھی انجام پا
سکتی ہیں مگر احکام شرعیہ کی معرفت جو مجتہد ہی پر خصوصیت کے ساتھ موقوف ہے اُس
سے کوئی غرض نہیں ہے۔

تقلید کا جو میں نے معیار بتلایا ہے کہ جس شخص پر سب سے زیادہ اطمینان ہو اُس کی تقلید
کی جائے۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تقلید کے لئے ایک شخص کی تخصیص
کس لئے؟ ظاہر ہے کہ وہ فرد اکمل جس پر سب سے زیادہ اطمینان ہے وہ محدود ہی
حیثیت رکھتی ہوگی۔ یہ تو احکام شرعیہ کو بالکل معمولی چیز سمجھ لینا ہے کہ جو بھی عبا بردوش
قبا دربر اور عمامہ برسر مل جائے اُسی سے مسئلہ دریافت کر لیا جائے۔

میں تقلید کے حصہ بخرے کرنے کا بھی حامی نہیں ہو سکتا یعنی بعض مسائل میں ایک
مجتہد کی تقلید کی جائے اور بعض میں دوسرے کی کیونکہ اکثر مسائل ایسے ہیں جو باہم دست
دگریباں ہیں اور لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں مقلد یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سے
مسائل ہیں۔ اگر اس نے دو چار آدمیوں کی مختلف مسائل میں تقلید کی تو بسا اوقات یہ
صورت پیش آئے گی کہ ایسے مسئلوں میں جو باہم تعلق رکھتے ہوں یہ تفریق کر دے
گا اس طرح کہ ایک مسئلہ میں ایک مجتہد کے فتوے پر عمل کرے گا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے
مجتہد کے فتوے پر جو اس کے مخالف ہے۔ نتیجہ اس کا عمل وہ ہوگا جو دونوں کے
نزدیک باطل ہے۔

یہ ویسا ہے جیسے آپ کو ایک مکان بنوانا ہے اس میں ظاہر ہے کہ دو رخ ہوں

گے ایک مشرقی اور ایک مغربی۔ آپ ایک انجینیر کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ اُس
کے مشرقی پہلو کا نقشہ بنا دو، اُس نے جو خاص چیزیں ہیں مثلاً دالان، کمرے رہنے کے
اُس طرف بنا دیئے اور اُس کے ذہن میں یہ ہے کہ دوسرے ضرورت کے مقامات
جیسے حمام، باورچی خانہ، پاخانہ وغیرہ دوسری طرف بن جائیں گے اس کے بعد آپ
دوسرے انجینیر کے پاس گئے اور بغیر پہلے نقشہ کے دکھلائے ہوئے مغربی جانب کا
نقشہ بنانے کی اُس سے خواہش کی، اُس نے بھی رہنے کی زیادہ اہم اور ضروری چیزیں
اس طرف بنا دیں اور اس کے خیال میں یہ ہے کہ دوسری چیزیں مشرق کی طرف بن جائیں گی اب یہ دونوں نقشے لئے اور ان کے مطابق مکان
تیار کرایا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف کمرے، دالان متعدد موجود مگر مکان بھر میں حمام،
پاخانہ، باورچی خانہ اور دیگر ضروریات کی تمام چیزیں بالکل ندارد۔ یہ نتیجہ کا ہے کا ہے۔
ایک مکان کے دو حصے کر کے دو انجینیروں سے نقشہ بنوانے کا پورے مکان کا
نقشہ ان دونوں میں ہر ایک جو بناتا وہ اپنے محل پر درست ہوتا مگر دونوں
نقشوں کے مل جانے سے نتیجہ وہ ہوا جو دونوں ہی کے نزدیک غلط ہوگا۔

یوں ہی کسی شخص کو بخار ہو اور کسی خاص جگہ درد ہو۔ ایک حکیم کے پاس جائے
اُس سے درد کا تذکرہ کرے اور اُس کے لئے دوا تجویز کرائے۔ دوسرے حکیم
کے پاس جائے اور اُس سے صرف بخار کو بیان کرے اور اس کا نسخہ لکھوائے پھر ان
دونوں دواؤں کا استعمال کرے۔ اکثر اوقات یہ صورت انتہائی مضرت رساں
ثابت ہوگی اور بعض اوقات مہلک ہو سکتی ہے حالانکہ ان میں سے ہر ایک
سے اگر بخار و درد دونوں کا ایک ساتھ علاج کرایا جاتا تو دونوں اس کا علاج
صحیح طریقہ سے کر دیتے اور صحت حاصل ہوتی۔

بالکل یہی صورت ہے مسائل شرعیہ کی بعض احکام ایسے ہیں جو ظاہر میں مختلف شعبوں سے متعلق ہیں مگر حقیقتہً وہ ایک ہی اصل پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو کہ ماہ صیام کی کسی شب اگر غسل کی ضرورت ہو جائے اور غسل سے قاصر ہو تو تیمم بدل غسل کرنے کا حکم ہے۔ اس تیمم کے بعد اکثر علماء کا قول ہے کہ سونا جائز نہیں ہے یعنی اگر سو جائے گا تو وہ تیمم باطل ہو جائے گا اور پھر روزہ درست نہیں ہوگا دوسرا قول جو بظاہر میری نظر میں قوت رکھتا ہے یہ ہے کہ سونا جائز ہے اور روزہ کے بطلان کا سبب نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بظاہر روزہ کے احکام سے متعلق ہے آپ نے اس مسئلہ کو کسی عالم سے دریافت کیا انہوں نے کہا کہ سونا جائز ہے کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ نے اُن کی تقلید کی اور تیمم کرنے کے بعد آرام فرمایا۔

دوسرا یہ مسئلہ ہے کہ سو کر جب آنکھ کھلے اور نماز صبح پڑھنا ہو تو اب وضو کرے یا تیمم بدل غسل کرے۔

ظاہر میں یہ مسئلہ طہارت کا ہے اور نماز سے متعلق ہے آپ نے اس کو دوسرے عالم سے پوچھا انہوں نے فرمایا کہ نماز کے لئے پھر تیمم بدل غسل کرنا چاہیئے آپ نے اُن کی تقلید کی تیمم بدل غسل کر لیا اور نماز پڑھ لی۔

حالانکہ حقیقتہً یہ دونوں مسئلے بالکل ایک چیز سے متعلق ہیں اور آپ کا طرز عمل جو ہو اوہ کسی عالم کے فتوے کے اعتبار سے صحیح نہیں۔

اصل اختلاف جو ہے وہ یہ کہ تیمم غسل کے لحاظ سے بدل تام ہے یا بدل ناقص اور وہ حدث اصغر کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے یا نہیں۔ جو لوگ قائل ہیں کہ وہ بدل تام ہے اُن کے نزدیک سونا جائز ہے لیکن اس کے بعد نماز کے لئے

وضو کرنا چاہیئے۔ جس طرح اگر غسل کیئے ہوئے ہوتا تو وضو کرنا لازم تھا یا اگر وضو نہ کر سکتا ہو تو تیمم بدل وضو کرنا چاہیئے۔ لیکن جو لوگ بدل ناقص قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک سونا جائز نہیں، اور اگر سو جائے تو نماز کے لیئے پھر تیمم بدل غسل کرنا چاہیئے۔ اس لیئے کہ وہ پہلا تیمم باطل ہو گیا اور اب پھر یہ اسی نجاست میں مبتلا ہو گیا۔ جس میں اس کے پہلے تھا۔

آپ سو تو گئے مگر نماز کے لئے وضو نہیں کیا۔ تیمم بدل غسل کیا۔ یہ کسی کے نزدیک درست نہیں ہے۔ اور آپ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یا آپ کا روزہ باطل ہو گیا اور یا نماز اور اس اجمالی یقین کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کو نماز کی بھی قضا کرنا چاہیئے اور روزہ کی بھی۔

یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ اس امر کا کہ آپ نے آشیان عمل کو دو عملہ میں ڈال دیا۔ اب چونکہ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ کون مسائل باہم وابستہ ہیں اور کون غیر متعلق، اس لیئے آپ کے واسطے تو صحیح طریقہ کار یہی ہے کہ آپ ایک ہی مجتہد کے مقلد ہو جایئے۔ پھر جس مسئلہ میں وہ خود اجازت دے کہ آپ کسی دوسرے شخص کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اس میں دوسرے شخص کی طرف، وہ بھی وہ جس پر اسی طرح کامل اطمینان ہو، رجوع کرنا جائز ہوگا۔

تقلیدِ میت

ایک امر جس کے متعلق شبہ واقع ہوتا ہے وہ تقلیدِ میت کا مسئلہ ہے۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ کسی زندہ مجتہد ہی کی تقلید کی کیا ضرورت ہے۔ بقاء بر تقلید میت کو تو بعض علماء بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مگر جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً خود تقلید کا جواز اصل اور قاعدہ پر تو مبنی ہے نہیں۔ قاعدہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہر شخص خود مسائل دینیہ کی واقفیت اور تحقیق کا ذمہ دار ہوتا۔ یعنی مجتہد ہونا ہر شخص کے لئے ضروری ہو مگر چونکہ یہ امر نظامِ زندگی کے خلاف ہے اور دوسرے ضروریات کے معطل ہو جانے کا باعث۔ اس ضرورت کی بناء پر تقلید کی اجازت ملی ہے۔ لیکن جو بات ضرورت کی بنا پر ہوتی ہے وہ ضرورت ہی کے دائرہ میں محدود ہوتی ہے۔ اور اس سے زیادہ آگے بڑھنے کیلئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ تقلید کے جو دلائل ہیں وہ تقلید اموات کا بھی فتوے دیتے ہیں یا نہیں۔

ان میں ایک تو نقلی دلائل ہیں۔ جیسے آیتِ قرآن (فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ) یا وہ احادیث جن میں ابان بن تغلب کو فتوے جاری کرنے کی ہدایت کی گئی ہے یا یونس بن عبدالرحمٰن کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان دلائل کا محل ورود صرف زندہ ہی اشخاص ہیں۔ اپنے اپنے

مقامات سے سفر کرنے والے لوگ بھی زندوں کی جماعت ہیں اور ابان بن تغلب اور یونس بن عبدالرحمٰن بھی زندہ ہی تھے۔ جب ان کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بطور کلیہ کوئی حکم نہیں پایا جاتا جس میں اموات بھی داخل ہو سکتے ہوں۔

رہ گیا عقلی فیصلہ کہ ناواقف لوگ واقف کار افراد کی طرف رجوع کریں۔ اس کے لحاظ سے جس قدر نقطۂ حقیقت تک پہنچنے کا زیادہ گمان ہوگا۔ اسی کو ترجیح حاصل ہوگی۔

زمانہ کے گزرنے کے ساتھ افکار میں توسعہ ہوتا ہے۔ اور سابقین کے نتائج نظر و فکر جو لاحقین تک پہنچتے ہیں پھر انکی تحقیق و تدقیق سے ان میں بہت سے دروازے نئے کھلتے ہیں اور بہت سے شعبے بحث و نظر کے جدید پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے زندہ اشخاص کی طرف جو علم و کمال میں اعلےٰ درجہ رکھتے ہوں۔ مسائل دینیہ میں رجوع کرنا واقع تک پہنچنے کا زیادہ قریب ذریعہ ہے۔ پھر ایک مجتہد کے فتوے کے لفظوں میں اکثر مقلدین کو دھوکا ہوتا ہے۔ اگر مجتہد زندہ ہے تو اس سے دریافت ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اور اگر انتقال ہو گیا تو کیا کیا جائے؟ یاد رکھئے کہ فرقۂ شیعہ میں علم فقہ کو جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ وہ صرف اسی کا نتیجہ ہے کہ تقلید اموات جائز نہیں رکھی گئی۔ ورنہ آج علم فقہ اسی نقطہ پر نظر آتا جو ابن جنید اسکافی اور ابو عقیل عمانی وغیرہ کے نظریات میں محدود تھا۔ جن میں سے اکثر کا مخالف

حقیقت ہونا اس وقت بدیہیات میں داخل ہو گیا ہے۔ فرقۂ شیعہ میں ذری عقلی جمود نظر آتا کہ جو دوسری جماعتوں میں احکام شرعیہ کے بارے میں موجود ہے۔ اس بنا پر کہ انہوں نے اپنی علمی و اجتہادی طاقتوں کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا ہے۔ ان چند آدمیوں کے انتخاب سے جن کے بوسیدہ کاندھوں پر قیامت تک کے افراد کے عمل کا بار رکھ دیا گیا ہے۔

عمل کی پہلی منزل

تقلید صحیح طریقہ پر ہو گئی۔ یعنی ایک جامع الشرائط مجتہد کے فتاوے کو حاصل کر لیا گیا۔

خواہ اس کتاب کو دیکھ کر جس میں اس کے مسائل مجتمع ہیں۔ اور خواہ اس سے زبانی پوچھ کر اور خواہ ایک ایسے شخص کو دریافت کر کے جس کو اس مجتہد کے فتاوے محفوظ ہیں۔ ایسے لوگوں کو عراق و ایران میں "مسئلہ گو" کہا جاتا ہے۔ انہیں مجتہد کے فتاوے اس قدر محفوظ ہوتے ہیں۔ کہ بسا اوقات خود مجتہد کو اتنے ہر وقت پیش نظر نہیں رہتے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس کی رسم نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں مسائل دینیہ اور احکام شرعیہ کے لئے وہ مقبولیت ہی حاصل نہیں ہے۔ تقلید کے بعد سب سے پہلا اہم فرض جو سامنے آتا ہے وہ نماز ہے۔ اب سب سے پہلے جو وقت نماز کا آئے اس میں واجبی طور پر نماز ادا کرنا ہے۔ نماز کے لئے شرع کی جانب سے مقدمات قرار دیئے گئے ہیں۔ جن پر

نماز کی صحت موقوف ہے۔ ان شرائط میں بعض تو وہ ہیں۔ جو نماز کے ساتھ ساتھ عمل میں لائے جاتے ہیں۔ لیکن نماز سے پہلے جس چیز کا حاصل کرنا ضروری ہے وہ "طہارت" ہے۔ اور "طہارت شرعیہ" یعنی وضو اور غسل کے لیئے لباس و جسم کے پاک ہونے کی ضرورت ہے۔ اور پاک ہونے کا لحاظ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ نجاسات معلوم نہ ہوں۔ جن کے متصل ہونے سے انسان کا جسم یا لباس نجس ہو سکتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ضرورت ہے کہ نجاسات کا علم حاصل کیا جائے۔

نجاسات

بچوں کو احکام شرعیہ میں سب سے پہلے اس کا معلوم کرنا ضروری ہے اس لئے کہ بالغ ہونے کے موقع پر وہ طہارت شرعیہ حاصل کر سکیں اور نیز اس لئے کہ نجاست ایسی چیز ہے جو متعدی ہے۔ یعنی وہ کمسنی میں گنہگار نہ ہوں گے مگر ان کی نجاست گھر بھر میں پھیل جائے گی۔ اور اس کا اثر والدین کے اعمال پر پڑے گا۔

نجاست کے معنی اور اس کا فلسفہ

نجاست کے معنی گندگی یا کثافت یا میلے پن کے نہیں ہیں۔ نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کوئی صفت ہے جو بذات خود کسی شے میں پائی جاتی ہے

بلکہ وہ ایک شرعی حکم ہے۔ جیسے حلّت حرمت وغیرہ جو مختلف مصالح کی بناء پر شرع کی جانب سے قرار دیا جاتا ہے۔

اس کی نوعیتیں حسب ذیل ہو سکتی ہیں :-

پہلے (۱) یہ کہ حکم نجاست کا باعث واقعی گندگی اور کثافت ہو جو کسی شے میں پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے عموماً متمدن اور مہذّب اشخاص اس سے کراہت رکھتے ہیں چاہے وہ کسی خاص مذہب کے پابند نہ ہوں۔ اور شرع چونکہ فطرت کی ترجمان ہے اس لئے اس نے بھی ان چیزوں کو نجس قرار دیا ہے۔ اس ذیل میں داخل ہیں، پیشاب پائخانہ وغیرہ اسی لئے جہاں پہ یہ کراہت طبیعت کی اور گندگی کم ہے وہاں نجاست کا حکم بھی ہلکا ہے۔ مثلاً دودھ پیتا ہوا بچہ جو ابھی غذا نہ کھاتا ہو اس کے پیشاب سے فطرتاً طبیعت اتنی متنفر نہیں ہوتی جتنی ایک بڑے غذا کھانے والے بچے یا بوڑھے آدمی کے پیشاب سے۔ چنانچہ شرع نے بھی تفرقہ رکھا ہے۔ یعنی اس بچّہ کے پیشاب کے لیئے جو غذا نہ کھاتا ہو۔ باقاعدہ دھونے کی شرط نہیں رکھی ہے۔ بلکہ صرف پانی ڈال دینا طہارت کے لیئے کافی سمجھا ہے۔

دوسری (۲) صورت یہ ہے کہ نجاست کا حکم کسی سمیت یا مضرت کی بنا پر ہو اس میں بظاہر داخل ہے۔ کتّے اور سوّر کی نجاست کا حکم بلکہ اس میں اتنی شدت ہے کہ کتا اگر برتن کو چاٹ لے یا منہ ڈال دے تو جب تک تین مرتبہ مٹی سے مانجھ کر پانی سے پاک نہ کر

جائے نہیں پاک ہوگا۔

آج جبکہ طبی تحقیقات ترقی کے نقطہ پر ہے یہ منکشف ہوا کہ کتّے کے لعاب میں ایسے جراثیم ہیں جن کی قاتل صرف مٹی ہی ہو سکتی ہے اور کچھ نہیں سوّر کے متعلق بھی اگر اب نہیں تو کبھی اس طرح کا انکشاف ہونا قابلِ تعجب نہیں ہوگا۔ میتہ کی نجاست بھی غالباً اسی بنیاد پر ہے۔

تیسری (۳) صورت یہ ہے کہ نجاست کا حکم کسی شے سے طبیعت کو متنفر بنانے کے لیئے ہو تاکہ اس کے استعمال سے ممانعت کے مقاد کو قوت حاصل ہو جائے۔ شراب کی نجاست کا حکم اسی حیثیت کا ہے بات یہ ہے کہ شراب کا کیف، شراب کی مسرت اور شراب کی بے خودی جو برابر گوش زد ہوتی رہی ہے وہ انسان کی طبیعت کو لبھانے اور تحریک استعمال پیدا کرنے کا بہت قوی ذریعہ ہے۔ اس کے خلاف صرف نجاست کے حکم کی بنا پر طبیعت کو اس سے وہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک پابند شرع انسان کا دل اس کو چاہتا نہیں یہاں تک کہ حالت مرض اور انحصار علاج میں جبکہ بضرورت اس کا پلانا جائز ہو جاتا ہے اس وقت بھی نجاست قائم رہتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک طبیعی بات ہے کہ جو کام انسان چند بار کرے اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے۔ اور پھر بلا ضرورت بھی اس کی طرف رغبت کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ استعمال جو بضرورت ہے برابر اس احساس کے ساتھ ہو کہ یہ ایک قابلِ نفرت چیز ہے جسے بضرورت استعمال پہ مجبور ہو رہا ہوں تو عوض مانوس ہونے

کے انسان بے چین رہے گا کہ کسی طرح یہ ضرورت ختم ہو اور میں اس چیز کو ترک کروں جیسے انتہائی تلخ دوا جو کسی مریض کو پینا پڑے وہ برابر طبیب سے اصرار کرتا رہے گا۔ کہ غذا کے لئے جلد اس کو موقوف کیجئے، اسی طرح نجاست ایک روحانی تلخی پیدا کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان استعمال پر مجبور بھی ہو تو وہ جلد از جلد اس کے ترک کرنے کے لئے بے چین رہے گا۔ اور اس طرح اس کے بلا ضرورت استعمال کے جو مضر اثرات ہیں ان سے محفوظ رہے گا۔ اور شرع کی طرف سے اس کے حرام ہونے میں جو مفاد مضمر ہے وہ بدرجہ اتم حاصل ہو گا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور مصلحت ہو جو اصل میں کسی اور شے کے ساتھ متعلق ہو۔ لیکن وہ اس شے کی نجاست کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

اس ذیل میں میرے نزدیک نجاست کفار کا حکم ہے۔

نجاستِ کفّار

چونکہ اس مسئلہ میں بدقسمتی سے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور بعض روشن خیال افراد خود ہماری جماعت میں سے اس مسئلہ کی مذہبی حیثیت سمجھنے کے خواہش مند ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر ایک واضح تبصرہ کیا جائے۔ سب سے زیادہ واضح صاف اور روشن دلیل اس مسئلہ کی آیت قرآن ہے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ

"مشرکین بس ہمہ تن نجاست ہیں"

اس میں ان کے نجس ہونے کا بہت قوت کے ساتھ اظہار ہے، بات یہ ہے کہ نَجَس جیم کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ مصدر کو کسی ذات کی صفت قرار دینا حقیقی طور پر درست نہیں ہوتا۔ مثلاً "زیدٌ عدلٌ" یعنی زید عدالت ہے۔ بے شک اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی حد تک عادل ہے۔ اتنا کہ گویا مجسم عدالت بن گیا ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں کہنا تو یہی منظور ہے کہ مشرکین نجس ہیں۔ مگر اسی نجس ہونے کا اظہار انتہائی قوت کے ساتھ یوں کیا گیا ہے کہ وہ گویا مجسم نجاست ہی ہیں اور اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے۔ جس سے یہ منشا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں کوئی پہلو طہارت کا ہے ہی نہیں اور ہر حیثیت سے نجاست ہی نجاست ہے۔

لفظ نجاست کا تعلق خارجی اشیاء کے ساتھ جب ہو تو اس کے نظری معنی عرفِ عام اور شرع کے لحاظ سے مادی ہی نجاست کے ہوتے ہیں۔

سوادِ اعظم کا یہ کہنا کہ مشرکین کی روح اور ان کے دل نجس ہیں ایک ایسی تاویل ہے جو الفاظ کے ظاہری مفہوم پر ہرگز منطبق نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ ائمہ اہلبیت نے جو قرآن کے حقیقی مفسر تھے اس تاویل کی کوئی حمایت نہیں کی ہے۔

جو کچھ بھی اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے وہ مشرکین کے دائرہ کی وسعت، اور یہ کہ اس میں کون جماعتیں داخل ہو سکتی ہیں۔

ہمارے ملک کے باشندے ہندو بظاہر بت پرست ہیں۔ مگر ان میں

کے ایک روشن خیال طبقہ کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم ان بتوں کو خدا تھوڑی سمجھتے ہیں۔ ہم تو واحد حقیقی ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بُت صرف اس کی یاد کا ایک ذریعہ ہیں۔ اس طرح وہ موحد بن جاتے ہیں اور اپنے تئیں شرک کے دائرہ سے خارج کر لیتے ہیں۔

یہود اور عیسائی اہلِ کتاب ہیں، اس لیئے وہ بھی مشرکین کے تحت میں داخل نہیں ہوتے۔

مگر جس وقت ہم غور کرتے ہیں اور قرآن کے دوسرے آیات کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کے رو سے یہ تمام جماعتیں شرک کے تحت میں داخل ہیں۔

باوجودیکہ ان میں کے عام افراد اس تاویل سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور وہ اصنام کو یقیناً معبودِ حقیقی سمجھتے ہیں اور یہ تاویل صرف ایک محدود تعلیمیافتہ جماعت کی طرف سے ہے جو اپنے آبائی طرزِ عمل کو اپنی منطقی قابلیت سے معقولیت کا لباس پہناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی تاویل عرب کے جاہل کفار بھی اپنی بت پرستی سے متعلق پیش کرتے تھے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے ان کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" ہم ان کی صرف اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہم اللہ کا تقرب حاصل کریں" اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے نزدیک اللہ کی ہستی ایک جدا گانہ وجود رکھتی ہے اور وہ اصنام کو اُس سے متحد ہرگز خیال نہیں کرتے۔ ایک جگہ ہے

لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔

"اگر ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو یہ کہیں گے اللہ نے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصنام کو خالق کائنات بھی نہیں سمجھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں شرک فی الالوہیۃ یعنی معبود حقیقی غیر اللہ کو سمجھنا، اور دوسری چیز ہے شرک فی العبادۃ یعنی عملی طور پر اپنی عبادت کو غیر خدا کے لیئے بجا لانا"

پہلی قسم کے شرک کی مرتکب ظاہر بہ ظاہر دنیا کی کوئی جماعت نہیں۔ قرآن نے جس کو شرک کہا ہے وہ دوسرے ہی قسم کے مرتکب ہیں اور اس طرح ہندو جو بُت پرستی کے قائل ہیں، کوئی بھی تاویل اس کی کریں وہ مشرک کی تعریف سے خارج نہیں ہو سکتے۔

رہ گئے یہود و نصاریٰ۔ ان کو قرآنِ مجید میں صراحۃً کئی مقام پر مشرک بتایا گیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ آخر میں ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

اور عیسائیوں کے لئے عیسیٰ سے خطاب نقل کیا گیا ہے ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور خود عیسائیوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔

اس میں صاف عقیدۂ عیسائیت کو توحید کا مقابل قرار دیا گیا ہے

اور اسی سے آپ کو معلوم ہوگا کہ آریہ جماعت چونکہ خدا کے ساتھ روح و مادہ کو قدیم مانتی ہے تو وہ بھی عیسائیوں کی ہم قدم ہے اور ایران کے پارسی نور وظلمت کے مبداء عالم ماننے کی بنا پر مشرک قرار پاتے ہیں۔ پھر روایات صحیحہ جن میں علی بن جعفر، محمد بن مسلم کے روایات اور سعید الاعرج کا موثقہ ہے صراحتہً مجوس کو نجس بتلاتے ہیں اور دیگر معتبر احادیث سے یہود و نصاریٰ کی نجاست کا حکم بھی ثابت ہوتا ہے۔

اس کے خلاف پیش کی جاتی ہے یہ آیت کہ

طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ "کھانا ان لوگوں کا جنہیں کتاب دی گئی ہے تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے"

مگر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس آیت کا طہارت ونجاست کے مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ دیکھئے تو اگر اس کا طہارت کے حکم سے تعلق ہوتا تو پہلا جزو تو بالکل ٹھیک ہے، کہ اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے۔ مگر دوسرا جزو بالکل بھرتی کا اور بے کار ہوتا ہے کہ "تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے"

اس سے کیا اہل کتاب کو فتوے دینا مقصود ہے کہ وہ بھی مسلمانوں کو پاک سمجھیں۔ بلکہ ان دونوں ٹکڑوں پر برابر سے نگاہ ڈالنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا مطلب ایک دوسرا ہی ہے۔

بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں غلہ کی تجارت زیادہ تر یہود و نصاریٰ

سے متعلق تھی مسلمانوں کو کثرت سے آیات میں کفار کی موالات اور کسی طرح سے بھی ان کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اس لئے ان کو یہ تردد تھا کہ خرید و فروخت اور تجارتی معاملت ان یہودیوں کے ساتھ کرنا بھی ہمارے لئے درست نہیں ہے۔ آیت نے آکر اس شبہہ کو دور کیا اور بتایا کہ ان کے ساتھ معاملت اور خرید و فروخت، لین دین میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کو طہارت ونجاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اگر اہل کتاب نجس ہوتے تو اس حکم میں قید لگانے کی ضرورت تھی۔ اور جبکہ حکم مطلق ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ان سے لینا جائز ہے۔ یہ استدلال اسلئے درست نہیں ہے کہ کسی لفظ کی عمومیت سے انہی حیثیتوں میں فائدہ اٹھانا صحیح ہے کہ جن کے لحاظ سے وہ حکم دیا گیا ہے۔

فرض کیجئے قرآن مجید میں کتے کے شکار کی حلت کا حکم ہے۔ ان الفاظ میں کہ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ۔ اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کہ جس مقام پر کتے کا منہ پڑے اس کو پاک کر لیا جائے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ کتے کا منہ پاک ہے اس لئے کہ حکم اس لحاظ سے ہے ہی نہیں، وہاں مقصود صرف یہ ہے کہ اس جانور کو تم حلال سمجھو اور وہ مردار نہیں ہے کہ اس کا کھانا حرام ہو رہ گیا۔ یہ کہ کتے

کا منہ نجس ہے۔ یہ اپنے موقع پر ثابت ہے اور بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ یہ کہ ان کے ساتھ خرید و فروخت اور تعلقات تجارتی قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ کون چیزیں ان کے ہاتھ کی پاک ہوں گی۔ کون چیزیں نجس ہوں گی یہ ہرگز اس آیت میں بتایا نہیں جا رہا ہے۔ دیکھئے تو کہ اہل کتاب کے کھانے میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو خصوصیت سے مسلمانوں کے لئے حرام ہیں۔ جیسے سوّر کا گوشت وغیرہ۔ تو کیا اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کا بھی لینا جائز ہے؟ کیونکہ اس آیت میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اسی طرح وہ چیزیں جو ہاتھ لگنے کی وجہ سے نجس ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کہ ان کی طہارت بھی ممکن نہیں ہے اس آیت کے عموم کی بنا پر ان کا لینا جائز نہیں قرار پا سکتا۔

اور پھر احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام نے جن میں صحیح حسن اور مؤثق ہر طرح کے معتبر روایات موجود ہیں۔ یہ بتلا دیا ہے کہ اس آیت میں طعام سے مراد حبوب و فواکہ و بقول ہیں۔ یعنی خشک اناج اور پھل اور ترکاریاں، اس کے بعد کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ اس آیت کی نگاہ صرف خرید و فروخت پر ہے اور طہارت و نجاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ بہ حکم مسلمات مذہب شیعہ سے رہا ہے۔ اس طرح کہ اہل سنت کے مقابلہ میں گویا اس فرقہ کا مابہ الامتیاز ہے۔ جیسے مسئلہ متعہ۔ تقیہ وغیرہ یہ وہ مسائل ہیں جن میں متقدمین اور متاخرین علمائے مذہب شیعہ کا اتنا بڑا اجماع ہے کہ وہ بطور مسلمات شعار مذہب شیعہ سے سمجھے جاتے ہیں۔ غور کیجئے اصول و روایت پر تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نجاست کا مسئلہ فرقہ شیعہ میں اگر کسی جذبہ کی بنا پر تراشا ہوا سمجھا جائے تو وہ کیا جذبہ ہو سکتا ہے؟ صرف تعصب اور منافرت۔ لیکن سچ بتائیے کہ فرقہ شیعہ کو اپنے ہم ملت مسلمانوں کی جماعت سے جو فرقہ شیعہ کی مخالف تھی زیادہ نقصانات پہنچے یا یہود و نصاریٰ، مجوس اور ہندوؤں سے۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ شیعہ فرقہ کو دنیا کی کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں وہ صبر آزما مصائب برداشت نہیں کرنا پڑے جو غیر شیعہ مسلمانوں کے ہاتھوں۔ آج بھی اگر کسی شیعہ سے پوچھئے کہ تمہارے لئے انگریز اچھے ہندو اچھے یا دوسرے مسلمان، تو وہ دنیا کی دوسری قوموں کو ترجیح دے گا۔ اس لئے کہ ان کے ہاتھ سے اسے کوئی خاص تکلیف نہیں پہنچی ہے مگر سنی مسلمانوں کے نام سے۔

شیعوں کی آنکھ میں بغداد کے قید خانے اور بنی عباسیہ کے مظالم اور قصر حمرا کی دیواریں جن میں سادات کے خون کا گارا دیا گیا اور بغداد کی دیواریں جن میں سادات زندہ چنے گئے اور سلطان سلیم عثمانی کے حکم سے ستر ہزار شیعوں کا قتل عام اور اورنگ زیب کا خنجر رافضی کش

اور جہانگیر کے ہاتھوں قاضی نور اللہ شوستری کا قتل وغیرہ یہ سب واقعات پیش نظر ہو جاتے ہیں اور جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ شیعوں کو تعصب، نفرت اور عناد جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ ان مسلمانوں سے نہ غیر مسلم افراد سے جن سے شیعوں کو اگر امداد نہ بھی پہنچی ہو تب بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اس کے باوجود جب ہم شیعہ فقہ اور روایات مذہبی میں مسلمہ طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ وہ سنی مسلمانوں کو باوجود یکہ ان کی تلواریں ان کی گردنوں پر رہیں پاک کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ یہ چاہے ہمارے قاتل کیوں نہ ہوں مگر محمد رسول اللہ کے نام لیوا اور کلمہ گو ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ ہم کو اکل و شرب اور تعلقات معاشرت جائز ہیں اور ایک غیر مسلم سے ہم کو اکل و شرب جائز نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ کسی جذبۂ نفسانی پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک خالص اسلامی تعلیم ہے جو شیعوں کو اپنے آئمہ علیہم السلام کی زبانی پہنچی ہے اور وہ اس پر بلا کسی ذاتی جذبہ کی کارفرمائی کے قائم رہے ہیں۔ اور اہل سنت جو کفار کو پاک سمجھنے لگے ہیں وہ ملوکیانہ سیاست کا نتیجہ ہے۔ جس کے تحت میں ان کو ضرورت تھی کہ وہ ممالک غیر اور امم خارجہ سے تعلقات قائم کریں۔ لہذا اصولِ جہانبانی کے تحت میں ان کو ضرورت ہوئی کہ وہ اسلام کے حکم محکم کی خواہ مخواہ تاویل کریں۔ اور اپنے لئے کفار کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا راستہ کھول لیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے اس حکم کی مصلحت کیا ہو سکتی ہے

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نجاست ایک حکم شرعی ہے۔ جس کے لئے شے میں کسی گندگی یا سمیت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بہت سے مصالح ہو سکتے ہیں۔

کفّار کو نجس قرار دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں کسی طرح کی گندگی ہے ہرگز نہیں بلکہ بہت ممکن ہے کہ کوئی غیر مسلم انسان ایک مسلمان سے زیادہ صاف شفاف اور سجل رہتا ہو۔ کفار کو نجس قرار دینے کا باعث خاص اُن سے نفرت یا عداوت پیدا کرنا بھی نہیں ہے کیونکہ اسلام تو رواداری کا حامی ہے اور ہر ایک شخص سے خوش اخلاقی کو پسند کرتا ہے۔ بلکہ اس کا منشا کچھ اور ہی ہے۔

بات یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں پر کھلنے پینے اور طرز معاشرت ہر طرح سے کچھ خاص امتیازات مقرر کیئے تھے جو غیر مسلموں سے علیحدہ ہیں۔ غیر مسلم جماعتیں بہت سی ایسی چیزوں کا استعمال کرتی ہیں۔ جو مذہبی حیثیت سے ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔ دنیا میں "ہم پیالہ و ہم نوالہ" ہونا معاشرت کا ایک اتنا قوی درجہ ہے کہ جس سے ایک فریق کے دوسرے سے متاثر ہو جانے اور اس کے رنگ میں رنگ جانے کا بہت قوی امکان ہے۔ اس کے برخلاف صرف اکل و شرب کے نہ ہونے سے ایک ایسی خلیج حائل ہو جاتی ہے کہ چاہے کتنی ہی دوستی ہو اور آپس میں تعلقات قریب ہوں مگر پھر بھی یہ اندیشہ نہیں پیدا ہوتا کہ مسلمان ان چیزوں کے ارتکاب پر آمادہ ہو جائیں۔ جو غیر مسلمین سے مخصوص ہیں۔

اس لئے غیر مسلمین کی نجاست کے حکم کی تشریح کی گئی ہے

اس سے مقصود مسلمانوں کو اُن چیزوں سے علٰحدہ رکھنا تھا جو ان کے لیے ممنوع قرار دی گئی ہیں اور غیر مسلمین اُن کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک قانون جو کسی غالبی مصلحت کی بنا پر ہو جب بطور قانون نافذ ہو جائے تو اس میں عمومیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کہاں وہ خصوصی مصلحت موجود ہے اور کہاں نہیں۔ مثال کے طور پر سارادا ایکٹ کچھ خاص مضرتوں کی بنا پر نافذ کیا گیا جو زیادہ ہندوؤں کے یہاں انتہائی غیر معتدل شادیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ قانون ان مضرتوں کے لحاظ سے نافذ کیا گیا۔ لیکن اس کے بحیثیت قانون نافذ ہو جانے کے بعد اب اس میں عمومیت ہے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس جگہ وہ مضرتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور کس جگہ نہیں۔ اب تو بہرحال قانون کی پابندی کا سوال ہے۔

اسی طرح نجاست کفار کا حکم اگرچہ ایک اجتماعی مصلحت کی بنا پر ہے اغلبیت رکھتی ہے مگر جب اس کے لحاظ سے حکم بطور عمومی نافذ ہو گیا۔ اب مستثنیات اور جزئیات کا کوئی لحاظ نہ ہوگا۔

فرض کیجیئے کوئی غیر مسلم عملی طور پر اُن چیزوں میں سے کسی کا بھی استعمال نہ کرتا ہو جو مسلمانوں کے یہاں ناجائز ہیں یا کوئی مسلمان خصوصیت سے اپنے متعلق اعتماد کا اظہار کرے کہ ہیں جتنا بھی ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوں میں بھی دوسروں کے اخلاق سے متاثر نہیں ہوگا۔ ان صورتوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا جبکہ حکم بطور قانون عمومیت کے ساتھ نافذ ہو گیا۔ اور

میں کوئی ایسا استثناء موجود نہیں ہے۔

کُفر اور اسلام کے حدود

یوں تو اسلام اور ایمان دونوں بڑی مشکل باتیں ہیں۔ اگر انکو حقیقت کے لحاظ سے دیکھا جائے مگر طہارت و نجاست کے باب میں اس کا اعتبار ہرگز نہیں ہے۔ ورنہ ایک طرف تو سچے مسلمان کی زندگی دشوار ہو جاتی اس تلاش میں کہ واقعی مسلمان کون ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی جماعت میں ایک عظیم تفرقہ کی بنیاد پڑ جاتی۔ اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کو کافر کہکر اس کو نجس قرار دے اور اس سے پرہیز کرنا مذہبی حیثیت سے ضروری بتلائے۔ ظاہری طور پر کفر و اسلام کے درمیان ایک واضح حد مقرر کی گئی اور وہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسولُ اللہِ ہے جو شخص خدا کی توحید اور رسول ص کی رسالت کا زبان سے اقرار کرتا ہے وہ مسلمان سمجھا جانا چاہیئے۔ بشرطیکہ کسی ایسی بات کا کھلم کھلا انکار نہ کرتا ہو۔ جو تمام اسلام کے متفقہ مسائل میں واضح طور پر داخل ہے کہ اس سے مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کا وجوب یا شراب، زنا، سود وغیرہ کی حرمت۔

کسی بات کا عقلی استدلال کے لحاظ سے نفی توحید وغیرہ کے حدود میں داخل ہونا تک ظاہر بظاہر کفر کا موجب نہیں قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ کہنے والا اسے اس اقرار کے ساتھ نہ کہتا ہو کہ وہ خدا کو ایک نہیں جانتا

بلکہ تاویل سے کام لیتا ہو۔

اسی بنا پر اہلسنت کا فرقۂ اشاعرہ صفات خدا کو زائد بر ذات ماننے
کے بعد بھی مسلمانوں کی صف میں داخل رہا۔ اور خدا کی رویت کا قائل ہو
کر بھی مجسمہ کے ذیل میں داخل نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ آٹھ صفتیں
قدیم ذات سے الگ ہوتے کے بعد اللہ واحد نہیں رہا۔ اور رویت
کے قائل ہونے کے ساتھ مکان، حیّز اور جہت سے بے نیاز نہیں
رہ سکتا۔ اور جسم بن جاتا ہے۔ مگر یہ لوگ ان لوازم کے پابند نہیں
ہیں۔ کہیئے کہ خدا کو ایک نہیں مانتے؟ تو وہ کانوں پہ ہاتھ رکھیں گے
اور کہیئے کہ تم خدا کو جسیم مانتے ہو تو وہ انکار کریں گے۔ اس لئے
عقلی حیثیت سے وہ ایک حماقت کے مرتکب ہوں، مگر شرع کے رو
سے کافر نہیں قرار پا سکتے۔ قادیانی جماعت میں وہ لوگ جو مرزا
غلام احمد کو صاف صاف نبی کہتے ہوں بظاہر اسلام سے خارج ہیں
مگر احمدی کہ جو محمد علی صاحب کے متبعین ہیں اور مرزا غلام احمد صاحب
کو نبی یا رسول نہیں مانتے صرف ایک مجدد کی حیثیت کے قائل ہیں ان
کے اسلام سے خارج ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے۔

کوئی مسلمان اگر کسی مذہبی عقیدہ کے متعلق شکوک و اعتراضات
کا اظہار کرتا ہے تو صرف اتنے پر اسے کافر نہیں سمجھ لینا چاہئے۔
انسانی دماغ جب ذوق تحقیق سے روشناس ہو جاتا ہے۔ نیز وہ
ہر بات کی دلیل جاننے اور سمجھنے کا طلبگار ہوتا ہے۔ نیز انسان کی قوت

متخیلہ اکثر شکوک و شبہات کو سامنے پیش کرتی رہتی ہے۔ جس میں انسان کا
کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اگر اس شک اور شبہ کے پیدا ہونے کے بعد
تحقیق میں کوتاہی ہوئی اور اس شک نے عقیدہ کی صورت اختیار کر لی تو
وہ کفر کی منزل ہوگی جس میں ہمیشہ کی ہلاکت ہے۔

ضرورت ہے کہ شک و شبہ اور اعتراض جو دماغ میں گردش کرے
اسے پیش کیا جائے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن اگر "کفر نوازی" کی ترقی اس حد پر رہی کہ اعتراض اور شبہ کے اظہار
ہی پر "کافر" کا خطاب مل گیا تو کسی کو جراٴت ہی کاہے کو ہوگی کہ وہ
اپنے خیالات کا اظہار کر کے تشفی حاصل کرے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ
خیالات دماغ میں پرورش پائیں گے اور ایک وقت میں عقیدہ کی حیثیت
اختیار کر لیں گے۔ اب وہ شخص واقعی کافر ہوگا۔ مگر اس کی ذمہ داری
ہوگی ہمارے اس غلط طرز عمل پر۔

گذشتہ دور میں انگریزی تعلیم کے ساتھ جو بہت سے "کافر" پیدا ہوئے
اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہمارے اس غلط طریق کار پر ہے۔

ہم نے پہلے ہی یہ سمجھ لیا کہ انگریزی تعلیم کافر ڈھالنے کی مشین ہے
اب اگر کسی انگریزی دان انسان یا طالب علم نے بطور جستجو سہی کچھ بھی خیالات
مشککانہ ظاہر کئے تو ہم نے چھوٹتے ہی اسے کافر کہہ دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب تک تو کافر نہ تھا مگر ہمارے اس کہنے سے ہو گیا
اگر اس نے ہم سے تبادلہ خیالات چاہا تو چونکہ ہم سمجھتے تھے کہ ایک

"کافر" ہم سے گفتگو کرنا چاہتا ہے - اس لئے یا تو ہم نے اس کا موقع ہی نہ دیا
یا موقع دیا بھی تو مناظرانہ جوابات دے کر اسے خاموش کرنے کی نہ یادہ
کوشش کی۔ حالانکہ مناظرانہ جوابات سے معاند انسان خاموش تو ہو جاتا
ہے مگر ایک طالبِ حق کے دل کی خلش دور نہیں ہوتی۔ لیکن ہم تو یہ
سمجھ کر گفتگو کرتے تھے کہ یہ شخص طالبِ حق نہیں ہے۔ کافر ہے جو صرف
ہم کو نیچا دکھلانے کے لئے ہم سے خواہ مخواہ بحث کرنا چاہتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ "تعلیم یافتہ جماعت" اور "اہلِ علم" کے درمیان کی خلیج بڑھ
گئی۔ انہوں نے ان کے پاس آنا جانا چھوڑا - انہوں نے ان کی طرف
سے منہ موڑا۔

شکر ہے کہ اس صورتِ حال میں اب بہت حد تک اصلاح ہو گئی ہے
موجودہ زمانہ میں اکثر انگریزی کالج اور اسکولوں کے طلاب مذہبی مسائل
کی تحقیق کرتے ہیں اور تشفی حاصل کرتے ہیں - اہلِ علم کے مواعظ میں
اس جماعت کے بہت سے افراد شرکت کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں
اس صورت حال میں ترقی ہونا چاہئے - اور اب کبھی ایسا نہیں ہونا چاہئے
کہ کسی بڑے سے بڑے اعتراض کے اظہار پر کسی کو کافر سمجھ لیا جائے جب
تک ایک شخص واقعی اپنے کفر اور الحاد کے عقیدہ کا صاف صاف معترف اور
اس کا علمبردار نہ ہو۔

نواصب

کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ جو اہلبیتِ رسولؐ سے کھلم کھلا عداوت

کا اظہار کریں، وہ کافر ہیں - اور محکوم بہ نجاست ہیں۔

یہ کوئی آج کا مسئلہ اور تقاضائے وقت پر تراشا ہوا حکم نہیں ہے بلکہ
ہمیشہ سے فقہائے ملّت کا مسلّمہ ہے اور احادیث ائمہ معصومین میں اس
کی تصریح موجود ہے بلکہ اہلسنت کے معتبر اور مستند روایات و نصوص
بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔

پیغمبر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی حدیث یَا عَلِیُّ حُبُّكَ اِیمَانٌ وَ
بُغْضُكَ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ فریقین کے یہاں متواتر حیثیت سے وارد ہوئی ہے
علمائے شیعہ کے تصریحات دیکھنا ہوں تو ملاحظہ فرمایئے :-

تذکرۃ الفقہاء للعلامۃ الحلّی ج ۱ صہ ۸ - جامع المقاصد للمحقق الثانی ج ۱
صہ ۱۶ روض الجنان فی شرح ارشاد الاذہان للشہید الثانی صہ ۱۶۳ فقہ المعالم
للشیخ حسن ابن زین الدین الشہید الثانی صہ ۲۴۹ کشف اللثام للفاضل
الہندی ج ۱ ریاض المسائل للسید علی الطباطبائی ج ۱ مستند الشیعۃ للشیخ
احمد النراقی ج ۱ صہ ۳۵ وسائل الشیعۃ فی احکام الشریعۃ للسید محسن الاعرجی
صہ ۱۲۸ مفتاح الکرامۃ للسید محمد جواد العاملی ج ۱ صہ ۱۴۲ کشف الغطاء
للشیخ جعفر النجفی صہ ۱۲۳ جواہر الکلام للشیخ محمد حسن النجفی ج ۱ صہ ۱۵۰ نجاۃ
العباد للشیخ محمد حسن النجفی صہ ۵ الوجیز الرائق للسید العلماء السید حسین
طاب ثراہ صہ ۲ روضۃ الاحکام تصنیف سید العلماء ج ۱ صہ ۱۷ کتاب
الطہارۃ للشیخ مرتضیٰ الانصاری ذرائع الاحلام للشیخ محمد حسن المامقانی
کتاب الطہارۃ ج ۲ حصۃ دوم صہ ۲۱۹ ہدایۃ الانام للشیخ محمد حسین الکاظمی

ج ۲ ص۲۷۶ مرشد المومنین تصنیف جنت مآب ممتاز العلماء السید محمد تقی طاب
ثراہ ص۵ ذریعۃ الوداد فی منتخب نجاۃ العباد للحاج میرزا محمد حسین بن میرزا محمد خلیل
ص۳۵ فلک النجاۃ للسید مہدی القزوینی ص۲۱ منہج الرشاد للشیخ جعفر المشتری ص۱۷
نجم الزاد للشیخ محمد طرنجت ص۳۷ ذخیرۃ العباد للمیرزا محمد تقی الشیرازی ص۱۹ سفینۃ
النجاۃ للشیخ احمد آل کاشف الغطاء ج ۱ ص۱۰۲ وسیلۃ النجاۃ شیخنا المیرزا محمد حسین
النائینی ص۲۱ ص۵۶ عروۃ الوثقیٰ للسید کاظم الطباطبائی مطبوعہ صیدا ج ۱ ص۲۵

پھر موجودہ زمانہ میں اگر علماء سے اس طرح کے فتاوے حاصل کیے جائیں تو تحصیل حاصل ہی تو ہوگا۔ مگر حالات زمانہ کے تقاضا سے بعض لوگ ایسے فتاوے کی اشاعت سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اہلسنت بحیثیت مذہب ہرگز اہلبیتؑ سے عداوت نہیں رکھ سکتے۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی فضیلت وعظمت ان کے مذہب کا ایک جزو ہے۔

شاہ عبد العزیز دہلوی کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ جو اہل سنت میں اب بھی پوری مقبولیت رکھتی ہے۔ بلکہ ان کی مناظرانہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصلی شیعۂ علیؑ ہم ہیں اور جتنی احادیث شیعان علیؑ ابن ابی طالب کی تعریف میں وارد ہوئے ہیں وہ ہم پر منطبق ہیں۔

اس صورت میں کبھی یہ سمجھنا کہ سنی لوگ "نواصب" کے لفظ کے تحت میں داخل ہوں گے بالکل غلط ہے۔

بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی "سنی" اپنے کو سنی کہتا ہو۔ مگر اپنے مذہب کے خلاف حضرت علیؑ کی شان میں نامناسب الفاظ کہتا ہو، اور عداوت کا اظہار کرتا ہو تو ایسا شخص بے شک ناصبی ہوگا۔ اور علماء کے فتاوے کا محل قرار پائے گا۔ مگر یہ بالکل شخصی وانفرادی بات ہے۔ اس کا کسی فرقہ یا جماعت سے تعلق نہیں ہو سکتا۔ جس طرح اگر کوئی شیعہ اپنے تئیں شیعہ کہتا ہو مگر نعوذ باللہ خدا یا رسول یا ائمہ کی شان میں گستاخی کرے تو وہ کافر ہے اور اس کی شیعیت کا نام نہاد اقرار اس کے لیئے ہرگز سود مند نہیں ہے۔

اگر آپ ایسے شخص کو پہچان لیجیئے اور آپ پر ثابت ہو جائے کہ وہ اس قسم کے الفاظ اپنی زبان یا قلم پر جاری کرتا ہے تو ضرور اس کو کافر سمجھئے اور اس سے پرہیز کیجیئے۔

یاد رکھیئے کہ جب تک اسلام کے ظاہری پردہ کے اندر کچھ بھی گنجائش نکلتی ہے مسلم اور غیر مسلم ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ نہ غیر مسلمین کی نجاست کا حکم کبھی برطرف ہو سکتا ہے۔

ضرورت کے حدود

اس میں کوئی شک نہیں کہ ضرورت کی بناء پر اکثر حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔ مگر ضرورت کے معنی سمجھنے میں اکثر لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے۔

ضرورت کے عام معنی جو لوگ سمجھتے ہیں اُن کے لحاظ سے بلا ضرورت کھانا ہی نہیں کھایا جائے گا۔ چاہے وہ مسلمان شیعہ اثنا عشری کے ہاتھ کا پکا ہوا کیوں نہ ہو۔

پھر اس کے کیا معنی کہ ضرورت کے وقت غیر مسلم کا کھانا جائز ہے۔ دیکھئے ضرورت کے وہ معنی ہیں کہ جب وقت انسان کے لئے مردار حلال ہوتا ہے۔ وہ وقت کہ جب انسان کی زندگی موقوف ہو جائے اس حرام شئے کے ارتکاب پر۔ پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ ضرورت کی بنا پر جو شئے جائز ہوتی ہے وہ مقدار ضرورت کی پابند ہوتی ہے۔ یعنی زندگی کی حفاظت کیلئے استعمال جائز ہو گا۔ تو بس اتنا ہی کہ جتنے میں حیات کا تحفظ ہو جائے۔

اکثر لوگ خصوصاً وہ جو سرکاری دفتروں میں یا مشترک کالج اور اسکولوں میں ملازم ہیں غیر مسلمین سے پرہیز کے حکم میں بڑی دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ کسی حد تک میں ان دشواریوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ صرف مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے طرزِ عمل کی وجہ سے اگر مسلمانوں کا متفقہ رویہ یہ ہوتا کہ وہ غیر مسلمین سے پرہیز کرتے ہوتے تو یہ اسلام کا ایک مسلّمہ حکم سمجھا جاتا۔ اور اسے صرف شخصی تعصّب یا تنگ نظری پر محمول نہ کیا جاتا۔ جس طرح ہندوؤں میں یہ رسم برابر قائم رہی اور کوئی بھی دشواری پیدا نہیں ہوئی مگر مشکل

یہ ہے کہ ہمارے دوسرے مسلمان بھائی اس پر عامل نہیں ہیں۔ اس لئے ناواقف افراد اس کی مذہبی حیثیت کا احساس نہیں رکھتے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ دشواریاں ہماری قوت عمل کی کمزوری سے متعلق ہیں۔

اگر ہمارے افراد جہاں جہاں ہوں سختی کے ساتھ اس کی پابندی کریں اور یہ ظاہر کرتے رہیں کہ ہم یہ کسی ذاتی نفرت یا عداوت کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ ایک مذہبی اصول کی بنا پر مجبور ہیں تو رفتہ رفتہ یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی اور لوگ واقف ہو جائیں گے کہ یہ شیعہ فرقہ کی ایک مذہبی خصوصیت ہے جس کے وہ مذہبی حیثیت سے پابند ہیں۔

یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہندوؤں کے لئے جیل خانوں میں اس کا انتظام ہو کہ ہندو ہی کے ہاتھ کا کھانا دیا جائے اور یہ جیل کے قواعد کے منافی نہ ہو۔

سکھوں کے لئے داڑھی کے رکھنے کی اجازت جیل خانہ میں ہو اور جیل کے قواعد سے وہ مستثنیٰ ہو جائیں مگر شیعوں کے لئے یہ امر کہ ان کو مسلمان کے ہاتھ کا کھانا دیا جائے جیل کے قواعد کے خلاف ہو۔

یاد رکھئے کہ یہ صرف ہمارے احساس، عزم اور آہنگ کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ عبرت کے قابل یہ معاملہ ہے کہ سکھ

توجیل خانوں میں داڑھی رکھنے میں آزاد ہوں۔ لیکن مسلمان اس کے لئے آزاد نہ ہوں جبکہ سکھ صرف چند لاکھ ہیں اور مسلمان اس وقت ۹ کروڑ ہیں۔ اور داڑھی کا رکھنا مسلمانوں کے یہاں ایک مذہبی فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یہ نتیجہ ہے اس کا کہ سکھ اپنی مذہبی تعلیم کے پابند ہیں۔ اس لئے دنیا اُن کے مذہبی اصول کا احترام کرتی ہے اور مسلمان بحیثیت مجموعی اپنی مذہبی تعلیم کے پابند نہیں ہیں۔ اس لئے دوسرے ان کے مذہبی اصول کی کوئی قدر وقیمت نہیں سمجھتے۔

کتنا تعجب ہے کہ وہ لوگ جو ذرا ذراسی بات پہ مداخلت فی الدین کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ان باتوں کو دیکھتے ہیں اور ان پر کبھی زبان تک نہیں ہلاتے۔ یہی صورت ہے بالکل اس مسلم اور غیر مسلم کے معاملہ کی۔ اگر شیعہ سختی کے ساتھ اس کے پابند ہوں تو دوسرے ان کو بھی مراعات پر مجبور کر سکتے ہیں۔

اور اگر وہ خود ہی اس کی اہمیت کچھ نہ سمجھتے ہوں اور یا سرے سے پابند ہی نہ ہوں یا ایسی کمزور رسمی پابندی رکھتے ہوں کہ ذراسی سختی میں گھبرا جائیں اور علمائے سے فتاوے منگانے لگیں۔ غیر مسلمین کے اشیاء کے استعمال جائز ہو جانے کے لئے تو دوسروں کو بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ان کے اس مذہبی حکم کی کوئی مراعات کریں۔

یہ کون سی بات ہے کہ دوسری باتوں پہ قانون شکنی جائز سمجھی جائے

اور اس مذہبی اصول کی بنیاد قائم کرنے کے لئے جیل خانوں کے اندر قانون شکنی جائز نہ ہو۔

مگر اس کا کوئی اثر تو جب ہی ہو سکتا ہے جب اجتماعی حیثیت سے بڑے پیمانہ پہ ہو اور اگر سب نے "ضرورت" کی آڑ لے کر علماء سے فتاوے حاصل کر لئے اور جو غذا ملی اس کو "بادلِ ناخواستہ" سہی اطمینان سے استعمال جاری کر دیا۔ تو اگر چند "سر پھرے" اپنی بات پر قائم بھی رہیں تو اس کا کوئی نتیجہ تو نہیں ہو سکتا۔ مگر یاد رکھئے کہ فرض شناسی انسان کا جوہر ہے اور احکام مذہب کی وقعت تن پروری اور آسائش سے مقدم ہے۔

علاج کے سلسلہ میں خاص طور پر تساہل سے کام لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے نسخہ لکھوایا اور ہندو دکان سے نسخہ بندھوا لیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس دوا کا استعمال جائز ہے۔ اس لئے کہ "بضرورت" ہے بعد میں منہ پاک کر لیا جائے گا۔

مگر یہ ہرگز درست نہیں ہے لکھنؤ میں تو اب انگریزی دواؤں کی بھی مسلمان بلکہ شیعہ دوکانیں موجود ہیں۔ اس لئے اگر ڈاکٹر صاحب کا علاج بھی ہو تب بھی کوئی ضرورت نہیں کہ ہندو دواخانہ سے دوا لی جائے لیکن اگر انگریزی دوا کی دکان کسی مسلمان کی نہیں ہے تو آپ کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آپ کی زندگی اسی ڈاکٹری علاج پر منحصر ہے۔ لیکن اگر حکیم کے علاج سے بھی صحت کا امکان ہو تو پھر آپ کو ڈاکٹری علاج ہی ناجائز ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ واقعی "پابند شرع" ہیں تو آپ کو اس فرض کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئیے۔ اور اس میں تساہل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

عارضی نجاست

سابق میں جن نجاستوں کا نام لیا گیا۔ مثلاً پیشاب، پائخانہ، خون، کتا، سور، شراب، کافر وغیرہ یہ سب اصلی نجاستیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نجاست ان میں ذاتی ہے۔ غیر ممکن ہے کہ یہ چیزیں اپنی حالت پر باقی رہتے ہوئے پاک ہو سکیں ان کے علاوہ دنیا کی تمام چیزیں بذاتِ خود پاک ہیں۔ لیکن اگر وہ مذکورہ بالا اشیاء میں سے کسی سے تری کی حالت میں متصل ہو جائیں تو اُن میں عارضی طور پر نجاست پیدا ہو جائے گی۔ اس کو "متنجس" کہتے ہیں۔ یعنی وہ شے جو بذات خود نجس نہیں ہے مگر کسی شے سے متصل ہو کر نجس ہوئی ہے بے شک بعض چیزیں نظام شریعت میں ایسی بھی ہیں۔ جو کسی چیز سے متاثر ہو کر نجس ہی نہیں ہوتیں۔

یہ انسان کے باطنی اجزا ہیں۔ جیسے منہ کے اندر، پیٹ کے اندر، دماغ کے اندرونی حصے وغیرہ ان کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ یہ عین نجاست کے زائل ہونے پر خود بخود پاک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اکثر علماء نے زوال عین نجاست کو مطہرات سے قرار دیا ہے۔ مثلاً دانت سے خون نکلے تو جب تک وہ خون باقی ہے منہ کے اندر کا حصہ نجس ہے مگر ادھر خون

برطرف ہوا۔ ادھر یہ اندر کا حصہ پاک ہو گیا۔ اس کے بعد ضرورت نہیں کہ اندر سے بھی منہ یا حلق کو پاک کیا جائے یونہی آنکھ اور کان کے اندر کے حصے اور دوسرے باطنی اجزاء۔ لیکن جہاں تک اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل نجاست وہی خون وغیرہ کی نجاست ہے جو ذاتی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے جب تک وہ باقی ہے حکم نجاست موجود ہے اور ادھر وہ زائل ہوئی حکم نجاست ختم ہو گیا لٰہذا یہ کہنا چاہیئے کہ باطنی حصے نجس ہوتے ہی نہیں۔ نہ یہ کہ نجس ہو تو جاتے ہیں مگر عین نجاست کے زوال کے بعد پاک ہو جاتے ہیں۔

یہی صورت ہے بالکل حیوانات کے جسم کی۔ ممکن ہے کہ ان کا جسم کسی نجاست سے آلودہ ہو جائے۔ تو جب تک وہ نجاست خود موجود ہے اس کا حکم موجود رہے گا۔ لیکن ادھر وہ نجاست زائل ہوئی اور اس کا حکم بھی رخصت ہوا۔ مثال کے طور پر کسی طائر کے منقار یا پنجے آپ کے سامنے نجاست میں آلودہ ہوئے جب تک وہ نجاست بھری ہوئی ہے وہ نجس رہیں گے لیکن ادھر نجاست چھوٹی ادھر وہ پاک ہوئے اسے بھی میرے نزدیک یہ نہیں کہنا چاہئیے کہ وہ نجس تھے۔ پاک ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ وہ نجس ہوتے ہی نہیں۔

غور کیجیے تو شرع کا مذکورہ بالا حکم بالکل طبع انسانی کے مطابق ہے پیشاب، پائخانہ وغیرہ کی نجاست جیسا کہ سابق میں بتایا گیا ہے۔ زیادہ تر ذاتی گندگی اور تنفر طبعی کے لحاظ سے ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی

حقیقت ہے کہ ان تمام اشیاء سے تنفر پورا پورا اسی وقت ہوتا ہے۔ جب وہ ظاہری حصوں میں پائی جاتی ہوں۔ انسان کو تصور تک ان اشیاء کی نجاست و کثافت کا نہیں ہوتا۔ اسوقت تک جب تک کہ یہ اندر مستور ہوں۔ اسی لئے یہ شخص اس حالت میں کہ جب احساس ان چیزوں کی موجودگی کا اپنے اندر ہو مثلاً پائخانہ یا پیشاب لگا ہو ہر مقدس سے مقدس مقام پر چلا جاتا ہے اور نہ اسے خیال ہوتا ہے نہ کوئی دوسرا احساس کرتا ہے کہ یہ کسی نجاست کو اس پاکیزہ مقام پر لے گیا حالانکہ انہی میں سے کوئی چیز ذرا سی بھی اگر باہر اس کے کسی حصہ جسم میں بھری ہوئی ہوتی تو نہ یہ خود اس جگہ جاتا نہ کوئی دوسرا اس کا جانا پسند کرتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر اور باطن کے لحاظ سے انسان کے جسم کی دو دنیائیں الگ الگ ہیں۔ اور اس باطن حصہ کی دنیا ہی کو انسان اپنے سے الگ سمجھتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ بھی دیکھئے کہ انسان کے دہن کی رطوبت اس سے طبیعت کا تنفر اگرچہ اس درجہ پر نہیں ہے کہ شرع کی طرف سے اس کو نجس قرار دیا جاتا ہے۔ پھر بھی کسی حد تک اس میں یہ بات ضرور ہے۔ اس لئے خباثت کے تحت میں اس کا استعمال یقیناً حرام ہے۔ مگر یہ اسی وقت ہے کہ جب دہن سے الگ ہو اس حالت میں یہ تھوک کہلاتا ہے۔ اور اس وقت اس کی پستی اور حقارت کا پوچھنا ہی کیا۔ لیکن یہی جب دہن کے اندر ہو تو اسے لعاب کہا جاتا ہے اور اس حالت میں ورق گردانی کے وقت قرآن

کے صفحوں پر بھی پہنچے تو اہل ذوق کو کوئی اعتراض نہیں۔

سرخ، سفید، تروتازہ اور شاداب چہرہ کی رنگت سے خون کا رنگ پھوٹا پڑتا ہے۔ اور غصہ کی حالت میں تمتماتا ہوا چہرہ خون کی روانی کا صاف صاف پتہ دیتا ہے۔ مگر جب تک انتہائی خفیف بھی کھال کا پردہ موجود ہے ذہن میں خفیف سا بھی تصور کسی نجاست کا پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہی اگر چھلک جائے اور باہر نکل آئے تو چہرہ کو کسی شے سے پونچھنا ضروری ہے۔

طبی حیثیت سے دیکھئے تب بھی یہ معلوم ہوگا کہ یہ کثیف چیزیں جب باہر رہیں تو آس پاس کی ہوا میں مختلف بیماریوں کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں اور صحت عامہ کے لئے مضر ہوتے ہیں اور چیزوں کا کیا ذکر رطوبت دہن کے لئے آپ اسٹیشنوں پر، ریل گاڑیوں میں، مختلف عمارتوں میں یہ لکھا ہوا دیکھیں گے کہ تھوکنا ممنوع ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص جو ان مقامات پر آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت ہی ان رطوبتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔

طبعی آثار کی بنا پر بھی یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ یہ اشیاء جب باہر ہوں تو تعفن پیدا ہو کر دور تک ہوا میں اس کا اثر محسوس ہوگا اور ناگوار ثابت ہوگا۔ لیکن اندر ہونے کی حالت میں یہ آثار پیدا نہیں ہوتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شرع کی جانب سے ظاہر اور باطن کا جو تفرقہ قرار

دیا گیا ہے، وہ بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے۔

حیوانات کے اعضائے جسمانی کی طہارت سے انسانوں کو سہولت پیدا ہو گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ حیوانات پر خود تو کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی نہ اُن پر کوئی پابندی لازم کی جاسکتی ہے۔ ان کے ہاتھ پاؤں، منہ چونچ، پنجوں کے نجس ہونے کا اگر مطلب ہو سکتا تو صرف یہ کہ انسان ان سے پرہیز کرے۔ اگر پانی کا گھڑا رکھا ہے اس میں کوّا چونچ ڈال دے تو یہ گھڑا نجس سمجھا جائے۔ کپڑا دھو کر الگنی پر پھیلایا، چڑیا آکر بیٹھ گئی تو کپڑا ناپاک ہو جائے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کوّے کی چونچ اور چڑیا کے پنجے آپ کے قابو میں نہیں ہیں جو آپ اُن کی نجس مقامات سے حفاظت کرتے رہیں۔ اس صورت میں ان طائروں کا کوئی حرج تو نہیں ہے مگر آپ کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لیکن شرع کے اس حکم سے کہ ان جانوروں کے اعضا، نجاست کے متصل ہونے سے نجس نہیں ہوتے، بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔ اب اگر دیکھ لیا کہ اسکی چونچ پنجے، ہاتھ یا منہ میں کوئی نجاست بھری ہوئی ہو تب تو بے شک آپ کو اسے نجس سمجھنا پڑے گا۔ یہ اس جانور کے جسم کی نجاست نہ ہو گی بلکہ اس عین نجاست کا نتیجہ ہو گی جو اس میں بھری ہے۔ لیکن اگر کوئی نجاست بھری ہوئی نظر نہیں آتی تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اُس کو نجس سمجھیں۔

پانی کے اقسام

پانی بھی ایک ایسی چیز ہے جو اکثر حالات میں نجاست سے متاثر نہیں ہوتا۔ تفصیل اس کی حسب ذیل ہے۔

۱۔ آبِ باراں یعنی بادل سے برستا ہوا پانی۔

۲۔ آبِ جاری یعنی وہ پانی جس کا کوئی قدرتی خزانہ ہو۔ اور وہ اس سے سوتوں وغیرہ کے عنوان سے ابلتا رہتا ہو۔ اور اس میں داخل ہے سمندر، دریا، چشمہ، کنواں، پہاڑ سے نکلنے والا آبشار اور جو اسی نوعیت کی چیزیں ہوں۔

۳۔ آبِ کثیر یعنی وہ پانی جس کا کوئی خزانہ تو نہ ہو۔ مگر مقدار اس کی کم از کم ایک کر۔ یعنی اتنا کہ جس کی لمبائی، چوڑائی، گہرائی کی مکسر مقدار پیمائش میں ستائیس بالشت ہوتی ہو۔ یعنی اوسط تین تین بالشت اس کا طول، عرض اور عمق ہو۔

ان تینوں قسموں کا حکم یہ ہے کہ وہ نجاست سے متاثر نہیں ہوتیں۔ یعنی کسی نجاست کی ملاقات سے ان میں نجاست پیدا نہ ہو گی جب تک کہ نجاست کا غلبہ ان کے رنگ یا بُو یا مزہ میں تبدیلی نہ پیدا کر دے۔ بے شک اگر رنگ، بو یا مزہ میں تبدیلی ہو جائے تو نجس ہو جائے گا۔

غور کیجئے تو دنیا میں ہر جسمانی کثافت و نجاست کے دُور کرنے

کا ذریعہ پانی ہے۔ اب اگر پانی خود ہی نجاست سے متاثر ہو کر نجس ہو جایا کرتا تو پھر نجاستوں کے دور کرنے کا ذریعہ ہی کیا تھا۔ ہاں اگر نجاست اس حد پہ ہوئی کہ اس نے پانی پر غلبہ حاصل کر کے اس کے اوصاف میں تبدیلی پیدا کر دی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پانی کی قوت مدافعت بلے نجاست کے مقابلہ میں شکست کھالی۔

اب اگر آب جاری یا باران ہے اور اس کا سلسلہ قائم ہے تو چونکہ اسے برابر مدد پہنچ رہی ہے۔ تو جب بھی اس کی قوت مدافعت واپس آ جائے یعنی نجاست کا پیدا کردہ تغیّر زائل ہو جائے فوراً وہ پانی پاک ہو جائے گا۔ لیکن اگر آب راکد (ٹھہرا ہوا پانی) ہے یعنی اس کو خود کہیں سے مدد نہیں پہنچ رہی ہے تو ضرورت ہے کہ آپ اس کو مدد پہنچائیے یعنی زوال تغیّر کے ساتھ ایک کر طاہر پانی اس میں ڈالیے تب وہ پاک ہو جائے گا۔

آبِ مضاف

یہ سب اس پانی کا ذکر تھا کہ جو بغیر کسی خاص شے کی طرف نسبت دیئے ہوئے حقیقتہً "پانی" کہا جا سکے۔ لیکن ایسی سیّال چیزیں جنھیں بسا اوقات مجازاً کہہ تو دیا جاتا ہے مگر واقعی انہیں پانی کہنا درست نہیں ہے جیسے خاص خاص چیزوں کا افشردہ یا کھینچا ہوا عرق یا شوربا۔ ان کو کہتے ہیں "آب مضاف" یہ چاہے کتنے ہی زیادہ مقدار میں ہوں نجاست کے متصل ہوتے سے فوراً

نجس ہو جائیں گے۔

بے شک اگر اس طرح کی بھی کوئی سیال چیز آب جاری کی حیثیت رکھتی ہو یعنی زمین میں اس کا قدرتی خزانہ ہو اور وہ خود بخود ابلتی ہو جیسے تیل کے چشمے جو اکثر زمینوں میں قدرت کی طرف سے ودیعت کئے گئے ہیں ان کے متعلق کتب فقہیہ میں کوئی تصریح میرے پیش نظر نہیں ہے۔

احکام شرعیہ میں اپنی طبیعت سے کوئی فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ دل یہ کہتا ہے کہ اس طرح کی چیز مطہر تو نہیں ہو گی کیونکہ طہارت کا ذریعہ صرف پانی ہے اور یہ پانی کے مفہوم سے خارج ہیں۔ مگر نجاست کے متصل ہونے سے یہ نجس بھی نہیں ہو جائیں گے۔ ان کا اپنے سرچشمہ سے متصل ہونا اور برابر جاری رہنا ان کی اتنی حفاظت ضرور کرے گا پھر بھی جب تک کوئی شرعی دلیل سامنے نہ ہو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں کیا جا سکتا۔

مواقع طہارت

مذکورہ بالا نجاستوں کے متعلق شرع کی طرف سے یہ ممانعت تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ تمہارا جسم یا لباس ان سے کبھی متصل نہ ہو۔ کیونکہ ان میں بعض چیزوں سے جسم یا لباس کا آلودہ ہونا ناگزیر اسباب کی بنا پر ہوتا ہے جو ضروریات زندگی میں داخل ہیں اور اکثر حالات میں لاعلمی یا اتفاق کی صورت پر ہوتا ہے جو قدرت و اختیار سے باہر ہے۔ پھر یہ حکم

دیا جانا انتہائی دشواری کا موجب تھا کہ جونہی جسم کا اتصال ہو بس فوراً تم طہارت حاصل کر لو۔ خصوصاً عرب کے ایسے ملک میں جہاں اکثر پانی نایاب ہوتا تھا اور مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس لئے شرع نے اپنی معتدل حکیمانہ روش کے مطابق اس پابندی کو ایک دوسری نوعیت سے عائد کیا اور وہ یہ کہ بعض ضروریات زندگی اور ضروریات مذہبی کو طہارت کے ساتھ مشروط قرار دے دیا۔ ایک طرف کھانے پینے پر طہارت کی ضرورت۔ یہ ضروریات زندگی میں داخل ہے، دوسری طرف نماز میں طہارت کی حاجت یہ ضروریات مذہبی میں داخل ہے۔

اب ایک شخص کا ہاتھ نجس ہے تو وہ اس ہاتھ کو نجس رکھے مگر کھانا کھانے کے لئے اسے ہاتھ کو پاک کرنا ضرور ہوگا۔ اور جسد یا لباس نجس ہو تو وہ نجس رہے مگر نماز پڑھتے وقت اس جسد یا لباس کی طہارت لازم ہوگی۔ اس طرح ایک مسلمان ایک دن یا رات بھی ہرگز نجس حالت میں باقی نہیں رہ سکتا اور اگر وہ شرع کے اصول کا پابند ہے تو اُسے اس دوران میں طہارت کرنا لازمی ہے۔

مطہّرات

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ کچھ چیزیں بذاتِ خود نجس ہیں۔ یہ اپنی ہستی کے قائم رہتے ہوئے کبھی پاک ہو ہی نہیں سکتیں۔ بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی ہستی فنا ہو جائے تو نجاست بھی ختم ہو جائے

مگر اس کو پاک ہونا نہیں کہتے۔

استحالہ جسے مطہرات میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت یہی ہے استحالہ یعنی کسی شے کی حقیقت کا بدل جانا۔ اس طرح کہ وہ نجس شے باقی ہی نہ رہے جیسے کتا نمک زار میں گر کر نمک ہو جائے یا جل کر راکھ ہو جائے۔ یا اس سے دھواں یا بھاپ بنے۔ یہ نمک، راکھ، دھواں اور بھاپ پاک سمجھا جائے گا۔ کیونکہ نجس کتا تھا وہ اب باقی نہیں رہا۔ شراب کا سرکہ بن جانا اور انسان کے خون کا مچھر یا کھٹمل کے پیٹ میں جا کر اس کی طرف منسوب ہو جانا اور کافر کا مسلمان بن جانا یہ سب باتیں ایک ہی معیار کے تحت میں ہیں۔ یعنی اس شے کا باقی ہی نہ رہنا جسے نجس قرار دیا گیا تھا جس وقت کتے کا نمک بن گیا تو حقیقتاً کتا رہا نہیں جو نجس تھا۔ یہ نمک ہے اور نمک کو شرع نے نجس نہیں قرار دیا ہے۔ اسی طرح شراب سرکہ ہو گئی تو شراب رہی نہیں سرکہ ہے کہ جو شرعاً پاک ہے۔ نجس ہے کیا؟ انسان کا خون، اب یہ مچھر یا کھٹمل کا خون ہے لہٰذا پاک ہے۔ نجس کون ہے جو کافر ہو۔ یہ کافر نہیں مسلم ہے اس لئے پاک ہے۔

اگرچہ اکثر علماء نے استحالہ، انقلاب، انتقال اور اسلام کو علیحدہ علیحدہ مطہّرات میں شمار کیا ہے۔ مگر باریک بینی کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو ایک عقلی کلیہ کے تحت میں داخل کیا جائے۔ اور وہ حکم کا برطرف ہونا اپنے محل کے معدوم ہو جانے کے سبب سے۔ نجاسات عینیہ کے مادۂ اصلی یعنی ہیولیٰ میں طہارت پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے

اب رہ گئیں وہ چیزیں کہ جن میں عارضی طور پر نجاست پیدا ہوئی ہے
ان میں بھی ایک صورت یہ ہے کہ وہ شے ہی بالکل فنا ہو جائے اس طرح
کہ عام نگاہوں میں اسے "نیست" سمجھ لیا جائے، جیسے نجس لکڑی کا جل
کر راکھ ہو جانا۔ عام نگاہوں میں یہ ایک درجہ وہ ہے۔ جس میں شے
بالکل نابود ہو جاتی ہے، اس صورت میں اس کی نجاست بھی ختم ہو جائے
گی۔ دوسری صورت یہ ہے۔ کہ وہ شے باقی رہے اور اس کے موجود
رہتے ہوئے نجاست دور ہو جائے۔ حقیقت میں "تطہیر" اسی کا نام ہے
اور جن چیزوں سے یہ بات حاصل ہو انہیں مطہرات کہتے ہیں۔

ان میں سب سے اہم پانی ہے اور خشک زمین اور آفتاب۔

پانی

سب سے زیادہ آسان، ہمہ گیر اور پائیدار حیثیت رکھتا ہے، قدرت
نے اسے ہر جگہ کثرت سے پیدا کیا ہے اور عالم کائنات میں
اس کے مہیا ہونے کے لئے بہت ذرائع پیدا کئے ہیں۔

یہ ہر چیز کا مطہر ہے۔ لیکن یہ اگر خود نجس ہو جائے تو اس کی مطہر
سوائے اس کے کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

خشک زمین

اس سے صرف وہ چیزیں پاک ہو سکتی ہیں، جو طبعاً
زمین پر منتقل ہوا کرتی ہیں۔ جیسے جوتی کا تلا
ان کے لئے جو جوتی پہن کر چلتے ہیں اور پاؤں کا تلوا ان لوگوں کے لئے
جو ننگے پیر چلنے کے عادی ہوں اور وہ لکڑی جو کسی پابریدہ شخص کے
لئے پاؤں کی جگہ لگی ہوئی ہو۔ اور موٹر گاڑی وغیرہ کے پہیئے اور اسی

طرح کی تمام چیزیں۔

جب ان میں رواروی کی حالت میں نجاست بھر جائے تو اسی رواروی
میں نجاست کے چھٹ جانے کے بعد وہ پاک ہو جائیں گی۔

اس حکم میں زمین کے جذابی خصوصیات کے علاوہ سراسر افراد
جامعہ کی سہولت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ رفتار کی حالت میں ہر طرح
کی زمینوں پر چلنا پڑتا ہی ہے۔ انسان کے لئے بہت دشوار ہے
کہ وہ راستے میں اس کا لحاظ کرے اور خیال رکھے کہ اس کا پاؤں کب
اور کس جگہ نجس ہو گیا۔

اس کے بعد جب بھی وہ چل کر کہیں پہنچے تو جوتی کا تلا وغیرہ پانی سے
پاک کرنا ضروری سمجھے۔ یہ بھی دشوار امر ہے۔ پھر اگر آپ کا پیر نجس ہی
سمجھا جائے تو جہاں جہاں آپ جائیں وہ زمینیں بھی نجس ہوتی جائیں
لیکن زمین کے مطہر ہونے کی وجہ سے یہ تمام باتیں جاتی رہیں۔

آفتاب

اس کا بھی دائرہ محدود ہے۔ اس سے ان چیزوں کی طہارت
ہوتی ہے۔ جو عادتاً منتقل نہیں ہوتیں۔ جیسے زمین، دیواریں،
در اور زراعت اور درخت اور میوے جو درختوں پر لگے ہیں اور اسی
طرح کی تمام چیزیں۔ یہ اگر نجس ہو جائیں اور ان میں رطوبت ہو کہ جسے
آفتاب خشک کر دے تو وہ پاک ہو جائیں گی۔ یہ بھی مفادِ عامہ اور
سہولت کے لحاظ سے ہے۔ اس قسم کی چیزوں تک اکثر اوقات پانی
کا پہنچانا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے آسانی کے لحاظ سے یہ قانون نافذ

کیا گیا ہے۔

انسان کے نظامِ زندگی کی درستی اور آسانی میں ان مطہرات کو بہت بڑا دخل ہے۔ ان کے علاوہ بعض جزئی چیزیں اور ہیں جو بہت ہی تنگ دائرہ میں مطہر قرار دی گئی ہیں۔ جیسے نجاست خوار جانور کو مقررہ مدت تک بند رکھا اس طرح کہ وہ صرف پاک غذا کھائے اس کے پسینہ کی طہارت کے لئے۔ پتھر اور ایسی ہی سخت چیز جو نجاست کو دور کردے استنجا کی خاص صورتوں کے لئے۔

تبعیت یعنی کسی چیز کا دوسری شے کے ساتھ پاک ہو جانا جیسے شراب سرکہ ہو جائے تو وہ برتن جس میں وہ رکھی تھی پاک ہو جائے یا کافر مسلمان ہو جائے تو اس کا بچہ اس وقت سے مسلمان سمجھا جائے۔

مشکوک صورتوں کا حکم

طہارت اور نجاست کے باب میں اگر انسان کے لئے یقین کا حصول ضروری قرار دیا جاتا تو بڑی مشکل پیش آجاتی۔ اگر غور کیجئے تو روزمرہ کے ضروریات زندگی میں سینکڑوں چیزیں ایسی استعمال کرنا پڑتی ہیں، جن کے متعلق قرآن اٹھا کر طہارت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

جنہیں آپ خشک سمجھ کر نجاست کا تصور بھی نہیں کرتے ان میں نجاست کا شبہ موجود ہے۔ آپ آٹا دال، چاول بازار سے لیتے ہیں۔ مگر جب گیہوں، چنا، دھان کھیتوں سے کاٹا گیا تو کیا آپ دیکھ رہے تھے

کہ کون ہاتھ کس حالت میں اس سے لگ رہا تھا۔ پھر کن ہاتھوں سے وہ بھگویا گیا، کیسے ہاتھوں سے وہ پیسا گیا، اس وقت تک کہ جب تک آپ کے ہاتھ میں آیا کتنے ہاتھ اس میں لگے۔ پھر جب آپ کو یہ معلوم نہیں تو اس آٹے دال وغیرہ کو یقینی طور پر آپ پاک کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ اگر آپ طہارت کے لئے یقین کی ضرورت سمجھئے تو زندگی سے ہاتھ دھو لیجئے۔ ان صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے شرع کی جانب سے ایک عام اصول وضع کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کل شیئ طاھر حتی تعلم انہ قذر

"ہر شے کو طاہر سمجھو جب تک کہ اس کی نجاست کا یقین نہ حاصل ہو" یقین کے کیا معنی؛ جس میں کسی احتمال کی گنجائش نہ ہو۔ اگر آپ کے نزدیک ذرا سا بھی طہارت کا شبہہ اور امکان موجود ہو تو آپ اس امکان سے فائدہ اٹھایئے اور اس کا استعمال کیجئے شرع کی طرف سے آپ کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

بے شک دو صورتیں ایسی ہیں جن میں نجاست کا شبہہ سدِ راہ ہوتا ہے۔

(ایک) یہ کہ کسی شے کے متعلق سابقہ نجاست کا آپ کو علم ہو تو اب حصول طہارت کے لئے یقین کی ضرورت ہوگی۔ فقط امکان سے کام نہیں چلے گا۔

(دوسرے) یہ کہ دو یا چند محدود چیزوں میں کہ جن میں سے ہر ایک

آپ کا محل صرف قرار پاسکتی ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ بعض ان میں سے ضرور نجس ہیں مگر کوئی تعیین نہ ہو۔ تو اس صورت میں آپ کو سب سے پرہیز کرنا ضروری ہو گا۔

احتیاط اور وسواس

احتیاط بہر حال بہتر چیز ہے۔ بشرطیکہ وسواس کی حد پہ نہ پہنچے۔

"احتیاط" کا معتدل درجہ یہ ہے کہ ایسی چیز جس میں نجاست کا قوی امکان ہے اس سے پرہیز کیا جائے۔ مثلاً وہ حلوائی جس کو آپ نے دیکھ لیا کہ وہ ہندو سے مختلف اشیاء مثلاً دودھ، گھی، وغیرہ خرید اکرتا ہے، اس کے یہاں کی چیزوں سے آپ پرہیز کیجئے۔ اگرچہ خصوصی طور پر اس شے کی نجاست کا یقین نہ ہو۔ لیعنی یہ شبہہ ہو کہ اس مٹھائی میں شاید مسلمان کے یہاں کا دودھ، گھی استعمال کیا گیا ہو۔ مگر وسواس کی حد یہ ہے کہ آپ خواہ مخواہ کے امکانات نجاست کے لئے اپنے ذہن سے پیدا کریں۔

ایک شیعہ مومن آپ کی دعوت کرتا ہے اور آپ اس کے یہاں کے کھانے سے صرف اس لئے پرہیز کرتے ہیں کہ شاید اس نے غیر مسلم کے یہاں کی چیزیں منگوائی ہوں۔ یا شاید اس کے ملازم نے لاعلمی میں غیر مسلم کے یہاں سے خریداری کر لی ہو۔ آپ کسی کی ملاقات کو جاتے ہیں اس کے یہاں فرش پر بیٹھنے میں تکلف کرتے ہیں کہ شاید یہ بچھونا

نجس ہو کوئی مرد مومن آپ کی ملاقات کو آتا ہے آپ اپنے بیٹھنے کا بچھونا سمیٹ لیتے ہیں کہ کہیں اس کے کپڑے نجس نہ ہوں۔ آپ سے کوئی مسلمان مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ اپنا ہاتھ کھینچ لیتے ہیں کہ کہیں نجاست میرے ہاتھ میں نہ لگ جائے۔ خشک راستہ ہے۔ کیچڑ، تری کا نام ونشان نہیں مگر آپ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں چھینٹ نہ پڑ جائے۔ اس لئے دامن اٹھائے اور کپڑے سمیٹے ہوئے راستہ چلتے ہیں۔ استنجا کے لئے ایک لوٹا کافی نہیں ہوتا اور ذرا سا ہاتھ پاک کرنے کے لئے سرتاپا حوض میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہ ہے وسواس جس کو لوگ طہارت سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ مگر شریعت کے حکم طہارت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

یہ لوگ اپنی زندگی تباہ کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی زحمت کا سبب بنتے ہیں۔ معصوم نے اس قسم کی "احتیاط" یا طہارت کو شیطانی عمل کا لقب دیا ہے اور اس کے ترک کرنے کی سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے ملاحظہ ہو عبد اللہ بن سنان کی روایت کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے ایک شخص کا تذکرہ کیا جو وضو اور نماز میں مبتلا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وسواس کی وجہ سے گھنٹوں میں وضو اور نماز بجالاتا ہے۔ حالانکہ وہ سمجھدار آدمی ہے۔ حضرت نے فرمایا وَاَیُّ عَقْلٍ لَہٗ وَھُوَ یُطِیْعُ الشَّیْطَانِ "کیسا سمجھدار ہے وہ کہ شیطان کے کہنے پر چلتا ہے"

عبد اللہ بن سنان کو تعجب ہوا۔ کہا یہ کیسے۔ آپ نے فرمایا اس سے

خود پوچھ لے کہ یہ جو کچھ وہ کرتا ہے کس کے ہاتھوں ہے وہ کہے گا کہ شیطان کے ہاتھ سے پریشان ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وسواس رکھنے والے اکثر خود اپنے ہاتھوں پریشان بھی ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنے رویہ کی تبدیلی پر قادر نہیں معلوم ہوتے تعجب نہ کیجئے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ اس طرح کے وسواس کا شکار کیونکر ہو جاتے ہیں۔

کیونکہ یہ تو ایک دماغی عدم توازن ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بیماری جاہل اور عالم کو نہیں دیکھتی۔ پھر شیطان کی سیاست بھی یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اسی راستہ سے گمراہ کرتا ہے جدھر اس کی طبیعت کا رجحان زیادہ ہوتا ہے ایک پابند شرع انسان دوسرے معاصی میں مبتلا نہیں ہوتا تو وہ وسواس میں گرفتار ہو کے اکثر امور خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں اپنی اس کمزوری یا عدم اعتدال کا احساس ہے اُن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جلد اپنی طبیعت پر جبر کر کے اپنے تئیں دو کیں اور خیال خود کچھ دن "نجاست" سے بے پرواہی اختیار کر لیں تو امید ہے کہ رفتہ رفتہ راہِ راست پر آجائیں (خدا سب کو اعتدال کے راستے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے)

طہارتِ شرعیہ

یعنی، وضوُ غسُل اور تیمم

جسم اور لباس کو تمام نجاستوں سے پاک رکھنے کے بعد نماز کے لئے ایک خاص طرح کی نفسانی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ جو شرع کے مقرر کئے ہوئے طریقہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ذریعہ ہے "وضو" اور "غسل" اور ان دونوں کے ممکن نہ ہونے کی صورت میں تیمم جو اِن کا بدل ہو۔ یہ نماز کے ادا کرنے کے لئے شرع کی جانب سے واجب ہیں۔

لیکن "واجب" کی شرع میں دو قسمیں ہیں۔

ایک واجب توصلی، اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف کسی شے کا عالم وجود میں آنا۔ شارع کو مد نظر ہے۔ وہ کسی طرح بھی ہو جیسے آپ کا کوئی کپڑا نجس ہو اسے پاک کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ آپ بقصد و ارادہ ہی ایسا کریں۔ بلکہ اگر بلا قصد آپ اسے حوض میں ڈال دیں یا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اسے پاک کر دے۔ یا ہوا کا جھونکا ایسا آئے کہ جو اُسے حوض میں لے جا کر ڈال دے تب بھی وہ پاک ہو جائے گا۔

دوسری قسم ہے واجب تعبدی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف کسی شے کا عالم وجود میں آنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ایک خاص قصد کے

ساتھ اس کا بجا لانا منظور ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن میں نیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وضو، غسل اور تیمم اسی طرح کی چیزیں ہیں اور وہ بغیر نیت صحیح نہیں ہو سکتے۔

نیت کا فلسفہ

اگر اسلام کا مقصد صرف عالم ظاہر کی تعمیر ہوتی، اور مادی فوائد پہنچانا مقصود ہوتے تو صرف افعال و اعمال کی مادی حیثیت اس کے لئے کافی ہوتی۔

نماز سے اگر صرف ورزش مقصود ہوتی تو وہ اٹھا بیٹھی سے ہو جاتی اور اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ روزہ سے مقصود اگر فقط معدہ کا درست کرنا ہو تو وہ صرف فاقہ سے ہو جانا چاہیے اس کے ساتھ کوئی قصد شریک نہ ہو۔ اور اگر وضو سے صرف ہاتھ منہ کا صاف ہو جانا مقصود ہوتا تو وہ پانی کے تریڑوں سے ہو جاتا۔ خواہ کسی طرح سے بھی ہو۔ اور تیمم سے مراد اگر کچھ جراثیم کا فنا کرنا ہوتا جن کے لئے مٹی زہر کا اثر رکھتی ہے تو بس مٹی کا مَل لینا ہی کافی ہوتا وہ جس صورت سے ہو۔ مگر اسلام کا مقصد تو عالم ظاہر کے ساتھ عالم باطن کی تعمیر کرنا ہے۔ انسان کی روحانیت میں اضافہ کرنا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ پر وہ اثر ڈالنا ہے جس سے تقویٰ و پرہیزگاری کے درجوں میں اضافہ ہو اور نفسانی خواہشوں سے آزادی حاصل ہو۔

وہی روحانیت کا اضافہ خدا کی بارگاہ میں قرب ہے جسے "قربۃً الی اللہ" کے الفاظ سے تبلایا جاتا ہے۔ اس کے لئے صرف اعمال کی وہ حیثیت جو اعضاء و جوارح سے متعلق ہے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔

انسان کے ادراکات و احساسات کا اس کے حالات پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً وہ اثرات کہ جو دماغ سے متعلق ہیں وہ تو ادراک ہی سے وابستہ ہیں۔

ٹھنڈی سڑک پر جانا سہ پہر کے وقت تفریح کا سبب ہوتا ہے۔ مگر یہ جب ہی ہوگا جب انسان کو یہ خیال بھی ہو کہ وہ تفریح کے لئے جا رہا ہے۔ لیکن اگر کسی اپنے کام کے سلسلہ میں وہ روز ٹھنڈی سڑک کی طرف جاتا ہو اور اسی راستے سے واپس ہوتا ہو تو چاہیئے معدہ کی اصلاح اس مسافت کے پیادہ طے کرنے سے ہو جائے۔ مگر تفریح جس چیز کا نام ہے وہ نہیں ہو گی بس یہی رمز ہے جو نیت میں مضمر ہے۔

نماز کا یہ مقصد کہ ورزش ہو جائے قیام و قعود سے یقیناً پورا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کہ "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ" "نماز روکتی ہے شرمناک اور بری باتوں سے" یہ اس سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ روزہ کا یہ فائدہ کہ معدہ درست ہو جائے۔ صرف فاقہ کر لینے سے حاصل ہو سکتا تھا۔ مگر وہ

جسے (لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ) کے الفاظ میں روزہ کے حکم کا مقصد
قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس سے تو نہیں ہوتا۔ بلکہ ممکن ہے کہ انسان
اس ورزش کے ذریعہ جسمانی قوت حاصل کرے۔ اور اس فاقہ
کے سبب سے اپنی صحت جسمانی کو درست کر لے تو ایسے گناہوں
کا ارتکاب کرے۔ جن کا اس کے پہلے ارتکاب نہیں کرتا تھا
اس صورت میں تو نماز اور روزہ گناہوں کے اضافہ کا سبب
ہو سکتا ہے۔ برائیوں سے روکنے اور تقوےٰ پیدا کرنے
کا سبب کہاں ہوگا۔

یہ فائدہ جب ہوگا، تو اسی نیت سے یعنی وہ ادراک و احساس
جو دماغ سے متعلق ہے، وہ اگر پانچ وقت پر روزانہ صحیح طریقہ
سے پیدا ہوتا ہے تو یقیناً انسانی دماغ میں وہ تاثرات راسخ
ہو جائیں گے۔ جو اسے برائیوں سے روک سکتے ہیں۔ اور اسی
طرح روزہ۔

بات یہ ہے کہ فعل تو انسان کا کسی جزو خاص سے بدن
انسان میں متعلق ہوتا ہے۔ لیکن نفس کا تعلق تمام جسم کے ساتھ
یکساں ہے۔ اب اگر کوئی چیز ایسی ہو جو براہِ راست نفس کو
متاثر کر دے تو پھر وہ تمام جسد انسانی پر مساوی اثر ڈالے گی
اس طرح بہت ممکن ہے کہ کوئی چھوٹی سی آیت قرآن کی زبان
پر جاری ہو۔ ظاہر میں یہ ایسا کام ہے۔ جو ایک بہت مختصر

وقت میں ہو گیا اور ایک انتہائی مختصر حصّہ جسم یعنی زبان سے وہ عمل
میں آگیا۔ لیکن اسی ایک آیت میں اگر ادراک انسانی قوت کے ساتھ
متاثر ہو جائے تو وہی ایک آیت انسان کے روح و جسم دونوں کی صحیح
تربیت کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ نیت سے عمل میں یہی
بات پیدا ہو جاتی ہے۔

نیت کی حقیقت

نیت کیا ہے؟ یہ احساس کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ اور کس
کے لئے کر رہے ہیں؟

پہلے جزو میں وہ تمام امور داخل ہیں جو تعین عمل سے متعلق ہیں
یعنی یہ سمجھنا کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، کون سی نماز یعنی ظہر
مثلاً اگر اس کے پہلے کی بھی کوئی نماز ہے تو یہ ادا ہے یا قضا
اور دوسرا جزو وہ ہے جس کی طرف "قربۃً الی اللہ" سے اشارہ ہوتا ہے
بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ نیت بھی اذکار نماز کی طرح کچھ الفاظ
ہیں، جو زبان پر جاری کیے جاتے ہیں، وہ نماز پڑھنے میں زبان
سے یہ الفاظ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ "نماز پڑھتا ہوں ظہر
کی چار رکعت واجب قربۃً الی اللہ" بعض لوگ خیال کرتے
ہیں کہ اس میں دیر تک کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے
نیت ان کی بڑی دیر میں ہوتی ہے۔ مگر نیت تو حقیقتاً قصد

کا نام ہے۔ اور وہ وہ چیز ہے کہ جو ایک اختیاری فعل کے وجود
میں آنے کا محرک ہے۔ ایک انسان کوٹھے پر سے گر پڑتا ہے، اور
ایک اپنے پیروں سے کوٹھے پر سے اترتا ہے۔ نتیجہ ایک ہے
کہ دونوں کوٹھے پر سے نیچے پہنچ گئے، مگر پہلے کا فعل ارادی و
اختیاری نہیں ہے، دوسرے کا فعل ارادی و اختیاری ہے
اس لئے کہ قصد و ارادہ کے ساتھ ہے اسی طرح وضو اور نماز
وغیرہ، یہ نہ ہو کہ جیسے سوتے میں بہت سے لوگ چلتے ہیں۔ باتیں
کرتے ہیں ویسے سوتے میں کوئی نماز پڑھے، یا نشہ کی حالت میں ہو یا جا
رہا ہو، منہ دھونے مگر بھولے سے کہنیوں تک ہاتھ دھولے جیسے
وضو میں ہوتا ہے۔ یہاں یہ فعل بلا قصد و ارادہ انجام پایا ہے لیکن
اگر وضو ہی کرنا چاہتا ہے اور وضو کر رہا ہے تو بس یہی نیت ہے
اب اس پر زیادہ غور و تامل کی کیا ضرورت ہے۔ آپ گھر سے جب
نماز کا وقت آیا تو نماز کے لئے روانہ ہوئے۔ اگر نماز پیشِ نظر نہ
ہوتی تو اس وقت کے پہلے ہی چل کھڑے ہوتے۔ پھر اسی راستے
پر آئے۔ جس سے مسجد تک پہنچتے ہیں۔ اگر نماز کا خیال نہ ہوتا
تو امین آباد، حضرت گنج وغیرہ دوسرے مقامات پر کیوں نہ چلے
گئے۔ پھر اس مسجد میں آئے اور صفِ جماعت میں آ کر بیٹھے
مکبر کے "قد قامت الصلوٰۃ" کی آواز پر کھڑے ہوئے۔ یہ سب کیا
بغیر نماز کے خیال کے ہو رہا ہے۔ پھر جب امام نے تکبیرۃ الاحرام

کہدی تو اس کے بعد نماز کے شروع کر دینے میں آپ کیوں ڈرتے
ہیں کہ کہیں بلا نیت نہ ہو؟ اس کے لئے زیادہ دیر تک ہاتھوں
کو کانوں تک لیجا لیجا کر پلٹانے کی ضرورت کیا ہے۔ رب
اللہ اکبر کہہ دیجئے۔ اگر آپ خوابیدہ نہیں ہیں بیدار ہیں اور ہوشیار
بھی ہیں تو وہ اللہ اکبر قصد و ارادہ ہی کے ساتھ ہوگا اور اس
سے زیادہ نیت کے لئے کچھ اور ضروری نہیں ہے۔
یہ قصد وہ دماغ کے اندر مضمر صفت ہے۔ جس کی طرف
اکثر انسان کو پورے طور پر توجہ بھی نہیں ہوتی۔ آپ ملاحظہ کرینگے
کہ کبھی آپ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، چاہتے ہیں نماز
ظہر پڑھیں تو دل میں خیال آتا ہے، عصر کی نماز پڑھتا ہوں۔ پھر
خود ہی آپ اپنے تئیں ٹوکتے ہیں کہ نہیں، عصر نہیں ظہر، معلوم
ہوتا ہے کہ نفس کی گہرائیوں میں کہیں یہ مضمر ہے کہ آپ نمازِ ظہر پڑھ
رہے ہیں۔ ورنہ خود ہی اپنے خیال کی غلطی کا احساس کیسے ہوتا
اور آپ عصر کا تصور کر کے پھر ظہر کی طرف عدول کیوں کرتے۔
بے شک وہ دوسرا جزو نیت کا کہ "کس کے لئے یہ نماز ہے"
اس کا حقیقی تصور بہت مشکل چیز ہے۔ وہ مراتب معرفت و
ادراک سے وابستہ ہے۔ وہ ہر انسان سے دقتِ عمل
اتنا ہی ہوگا جتنی کہ اسے معرفت حاصل ہے۔ اس لئے
ٹھہرنے سوچنے سے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اسی

لیے شرعی حیثیت سے جو ضرورت ہے وہ ادنیٰ درجہ میں اس کا خیال کر لینا اور اس کے ساتھ دوسرے اغراض کا مدِنظر نہ ہونا، یہ وہ چیز ہے جس سے عمل رسمی طور پر صحیح ہو جائے گا مگر قبولیت کا درجہ اس کے آگے اور خضوع وخشوع کی منزل دوسری ہے۔ وہ درحقیقت اسی تصور کے بلند منازل ہیں۔ جن سے نماز میں خشوع کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ یوں آدابِ ظاہری کے لحاظ سے میں دس دفعہ وہ نماز پڑھ سکتا ہوں جس میں نگاہ سجدہ گاہ سے نہ ہٹے کسی جزوِ بدن کو حرکت نہ ہو۔ مگر واقعی خشوع تو بالکل دل سے متعلق ہے جس سے پھر لازمی طور پر اعضاء و جوارح پر بھی سکون کا عالم طاری ہو گا۔ اسی کو امام نے ارشاد فرمایا ہے۔ "لَوْ خَشَعَ قَلْبُهُ لَخَشَعَ سَائِرُ جَوَارِحِهِ" اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو تمام اعضا و جوارح پر بھی خشوع و خضوع طاری ہوتا۔ اسی تصور کا وہ کامل درجہ ہے کہ نماز میں ماسوی اللہ کی طرف کوئی توجہ ہی نہ ہو۔ یہاں تک کہ پاؤں سے تیر کھینچ لیا جائے۔ اور اس کی طرف التفات نہ پیدا ہو۔ اس کا تعلق نفس کے مراتبِ معرفت سے ہے اور اسی لیے وہ احکامِ شرعیہ اور قوانینِ رسمیہ کے حدود سے بالاتر منزل ہے۔

"ایں زمیں را آسمانے دیگر است"

الاعمال بالنیات

عبادت کا دار و مدار نیت پر ہے اور اسی کے ذریعہ سے عمل میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دیکھنے میں کوئی عمل مختصر ہو اور بہت کم وقت میں پورا ہو جائے۔ لیکن اگر نیت صحیح ہے اور پورے اخلاصِ قلب سے ہو گیا ہے تو وہ بڑے اعمال کا ہم پلّہ ہو گا۔ یہی معنی ہیں اس کے کہ "الاعمال بالنیات" اعمال بس نیتوں کے ساتھ وابستہ ہیں"۔ بلکہ بسا اوقات عمل کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہی نیت ہے جو معیارِ فلاح و نجات ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص ہے جو صدقِ دل سے اسلام لایا۔ مگر پہلی نماز کا وقت آنے کے پہلے ہی دارِ دنیا سے رحلت کر گیا۔ اس نے بظاہر کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے۔ مگر یہ جنت کا مستحق ہے۔ یہ آخر بغیر نماز پڑھے، زکواۃ دیئے، حج و جہاد بجا لائے کس طرح مصلین صائمین وغیرہ کی جنت میں پہنچ گیا۔ وہ اس کی نیت ہے جو اس کو منزلِ فردوس میں جگہ دے رہی ہے۔

اسی بنا پر امامؑ نے فرمایا ہے۔ "نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ وَنِيَّةُ الْكَافِرِ شَرٌّ مِنْ عَمَلِهِ" مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے اور کافر کی نیت اس کے عمل سے بدتر ہے"
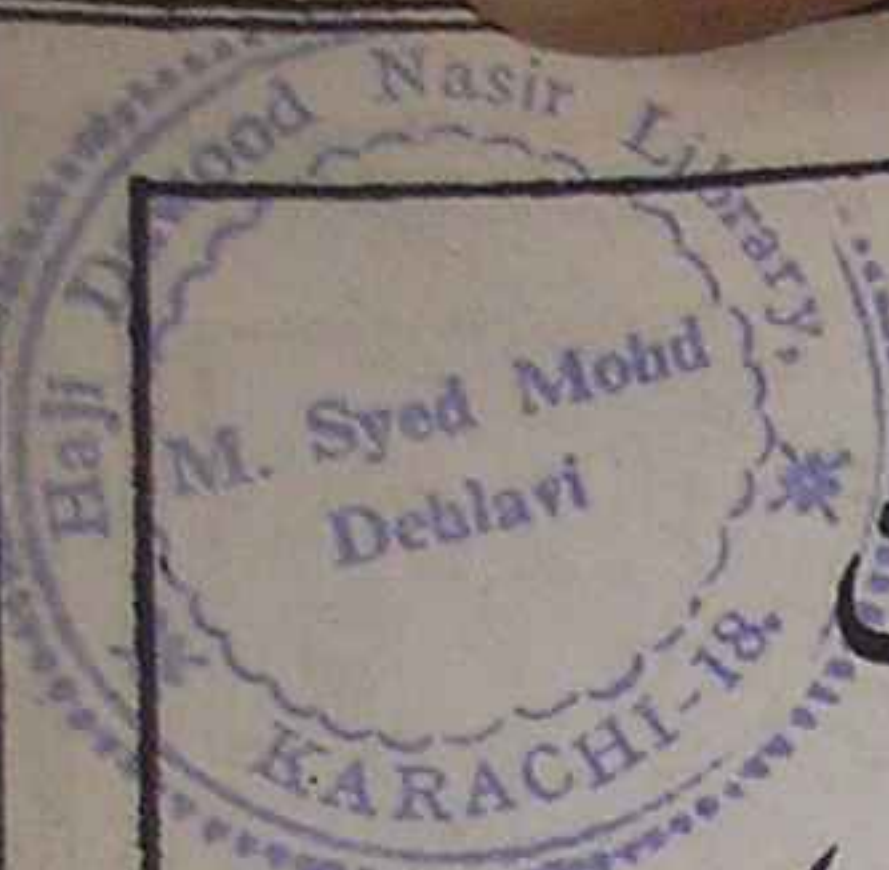
بات یہ ہے کہ عمل تو ہے محدود چیز اور اسباب و ذرائع کا پابند
ممکن ہے کہ ایک شخص کے پاس پیسہ نہ ہو، تو وہ زکواۃ نہیں ادا کر
سکتا۔ بیمار رہتا ہو۔ اس لیے روزہ نہیں رکھ سکتا۔ استطاعت
نہیں، حج کو نہیں جا سکتا درصورتیکہ اسباب موجود ہوں تو پھر بھی ایک
محدود ہی درجہ تک وہ ان اعمال کو بجا لا سکے گا۔ لیکن نیت بے
غیر محدود شے۔ اس کے لئے اسباب و ذرائع موجود ہونیکی ضرورت
نہیں۔ ایک بالکل بے بس اور تنگ دست انسان اس کو اگر جوش
و ولولہ، موجود ہے تو جس حد تک اس کی آرزوئیں وسیع ہوں اسی
حد تک وہ ثواب کا مستحق ہے۔ اب اس میں کیا شبہ کہ اس کی
نیت اس کے عمل سے بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن بدطینت بدسرشت
انسان کافر اس کو ممکن ہے فساد اور شرارت کے ذرائع کم حاصل
ہوں۔ مگر اس کے تاریک حوصلے اور خبیث ارادے ظلم کی آخری
حدوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی کو سمجھ کر شاعر نے خوب کہا ہے

یک حسینے نیست کہ گرد د شہید
ورنہ لب یارند در عالم یزید

اس کو ان لفظوں میں کہا ہے کہ نِيَّةُ الْكَافِرِ شَرٌّ مِنْ عَمَلِهٖ۔
"کافر کی نیت اس کے ظاہری اعمال سے زیادہ خبیث ہے"
دنیا میں لوگوں کی عمریں مختلف ہیں۔ کسی کی ستر برس کی عمر
ہوئی اس کو پچپن برس عبادت و اطاعت کے لئے ملے۔ کسی

کی عمر بیس ہی برس کی ہوئی۔ اس کو صرف پانچ سال ملے۔ اگر
ظاہری حیثیت سے اعمال دیکھے جائیں تو وہ اس کے مقابل
کبھی نہیں ہو سکتے۔ مگر نیت وہ ہے جو ان دونوں میں توازن
پیدا کر دیتی ہے۔ قدرت کی طرف سے اس کو موقع کم ملا،
اس کو زیادہ۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اس کا جوش اطاعت اور
ولولۂ عبادت اس سے بدرجہا زیادہ ہو تو اس کی کم مدت کی
کارگزاری اس کی زیادہ مدت کے اعمال سے بہتر ہو گی۔ یہی
وہ رمز ہے جسے امام نے بتلایا ہے۔ اس اعتراض کے جواب
میں کہ مومنین جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور کفار جہنم میں
ہمیشہ کے لئے داخل کئے جائیں گے۔

یہ جزا و سزا ہمیشہ کس لئے ہے۔ جبکہ اعمال ایک محدود عمر میں
تھے جو ختم ہو گئی۔ فرماتے ہیں انما خلد اهل النار فی النار
لان نیاتهم کانت فی الدنیا ان لو خلدوا فیها ان یعصوا
الله ابدا و انما خلد اهل الجنة فی الجنة لان نیاتهم
کانت فی الدنیا ان لو بقوا فیها ان یطیعوا الله ابدا فبالنیات
خلد هٰؤلاء و هٰؤلاء اہل جہنم اس لئے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں
گے کہ ان کی نیت دنیا میں یہ تھی کہ وہ اگر ہمیشہ دنیا میں رہیں
تو برابر معصیت ہی میں بسر کریں اور اہل جنت جنت میں اس
لئے ہمیشہ رہیں گے کہ ان کا قصد یہ تھا کہ دنیا میں وہ ہمیشہ

رہیں تو برابر خدا کی اطاعت ہی کرتے رہیں - ان ہی نیتوں کی بنا ر
پر دونوں کی جزا و سزا ہمیشہ قائم رہے گی"
بیشک نیت کی تصدیق عمل سے ہونا چاہئے - انسان اگر
کسی عمل خیر کا ارادہ کرکے خود ہی پشیمان ہو جائے یا باوجود
قدرت و تمکن پھر بھی اس کے انجام دینے میں سستی اور کاہلی
سے کام لے تو اس کا عمل خود ہی اس کی نیت کی کمزوری کا
ثبوت ہوگا۔ لیکن اگر نیت بخیر رکھے اور اپنی سعی جدو جہد
بھی کرے - مگر اسباب کے فقدان یا موانع کے پیدا ہو جانے
کی وجہ سے قاصر و عاجز ہو جائے تو بارگاہ احدیت سے
نیت کی بنا پر ثواب عطا کیا جائے گا - بلکہ ضمیر وہ چیز
ہے جس کی بنا پر اگر انسان کو جذب صادق اور ولولہ کامل
ہو بہت سے ان اعمال کا جن کا موقع گزر چکا ہے تو انسان اپنے
ضمیر کے کیفیات کی بنا پر ثواب میں شریک ہوگا - یہی وہ
چیز ہے جسے امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے - اس وقت جب
جنگ جمل میں خداوند عالم نے آپ کو غلبہ عطا فرمایا - اور
ایک شخص نے آپ کے اصحاب میں سے کہا کہ لوددت
ان اخی فلانا کان معنا لیری ما اتاکؑ اللہ سبحانہ
من الظفر علی اعدائکؑ "مجھے آرزو ہے کہ کاش میرا
بھائی فلاں شخص ہمارے ساتھ ہوتا اور وہ دیکھتا کہ خداوند عالم

نے کس طرح آپ کے دشمن پر فتح عطا فرمائی ہے" - تو آپ
نے فرمایا اھوی اخیکؑ معنا "کیا تمہارا بھائی ہمارے دوستوں
میں سے ہے" اس نے کہا کہ ہاں وہ آپ کے دوستوں میں
سے ہے - حضرت نے فرمایا فواللہ لقد شھدنا ولقد
شھدنا فی معسکرنا ھذا قوم فی اصلاب الرجال
وارحام النساء سیرعف بھم الزمان ویقوی بھم
الایمان۔
" تو پھر بخدا وہ میرے ساتھ تھا اور ہمارے ساتھ ہمارے لشکر
میں بہت سے وہ لوگ تھے جو ابھی مردوں کے صلب میں اور
عورتوں کے شکم میں ہیں - زمانہ ان کو باہر ظاہر کرے گا - اور
ایمان کو اُن کے ذریعہ سے قوت حاصل ہو گی"۔
یہ جو آپ کو تعلیم دی گئی ہے کہ آپ واقعۂ کربلا کے یاد
آنے پر کہئے یَا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزاً عَظِیْماً - یہ
صرف الفاظ ہی الفاظ نہیں ہیں بلکہ دل میں حقیقتاً اس تمنا کا
پیدا کرنا منظور ہے اور اس جذب و ولولہ کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ
اس اجر میں شریک ہوں مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اگر دل میں اس عظیم
معرکہ میں شریک ہونے کا جذبہ ہے تو اس کی تصدیق عملی یہی
ہو سکتی ہے کہ ہمارے سامنے جو دینی مراحل پیش ہوں ان میں
اپنے فرض کا احساس کریں - چاہے ان میں کتنی ہی شدت

اور سختی کیوں نہ ہو لیکن اگر معمولی معمولی امتحانات میں ہمارے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں تو ہرگز یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے دل میں واقعۂ کربلا لیسے عظیم موقع پر شرکت کا حقیقی ولولہ ہے اس صورت میں یہ الفاظ صرف الفاظ ہی ہوں گے۔ جو ہماری زبان سے نکلتے ہیں۔ جن کا نہ کوئی مفاد ہے اور نہ کوئی نتیجہ

مقصدِ عبادت

میں نے کہا کہ نیت میں دو چیزیں۔ کیا عمل بجا لا رہا ہے؟ اور کس کے لئے بجا لا رہا ہے۔ پہلی چیز آسان ہے۔ لیکن دوسری چیز انتہائی دشوار۔ اس کے لئے یہاں تک کہ ضروری مقدار ہے وہ تو یہ ہے کہ کوئی دنیوی مقصد پیشِ نظر نہ ہو یا کسی غیر خدا کی رضا جوئی عمل سے مدِ نظر نہ ہو۔ لیکن اس کے آگے یہ منزل ہے کہ آخرت کا کوئی مقصد پیشِ نگاہ ہو مثلاً یہ کہ ثوابِ آخرت کا حصول مدِ نظر ہو یا عقاب سے حفاظت۔ جہاں تک صحت عمل کا تعلق ہے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی وجہ سے عبادت باطل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں ثواب و عقاب، جنت و جہنم کا تذکرہ اسی لئے ہے کہ کمزور طبائع کے لئے محرک عمل ثابت ہو سکے۔ یہ ایک لطف خداوندی ہے کہ اس ذریعہ سے اس نے منزلِ اطاعت کی طرف ہم کو

قریب کیا ہے۔ اگر ان امور کا بوقت عبادت پیش نظر ہونا ناجائز ہوتا اور بطلان عمل کا سبب ہوتا تو ان امور کا تذکرہ کرنا اور یہ خوش آیند وعدے یا تہدید آمیز وعید کرنا خود خلاف لطف و احسان ہوتا کیونکہ فطرۃً ان ہی چیزوں کے تذکرہ کی بدولت ہمارے ذہن میں یہ خیالات زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ہمارے اعمال کے باطل ہونے کا سبب خداوندِ عالم ہوتا۔

بے شک عمل کی بلندی اور معراج کمال یہ ہے کہ اس قسم کے صحیح مقاصد بھی انسان کے پیش نظر نہ ہوں اور وہ عمل کو صرف خدا کی رضا جوئی کے لئے انجام دے۔ یہ بہت معزز درجہ ہے جس تک ہر انسان نہیں پہنچتا ہے۔

امیر المومنینؑ نے اس کو حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے

ان قوما عبدوا اللہ رغبۃ فتلک عبادۃ التجار وان قوما عبدوا اللہ رھبۃ فتلک عبادۃ العبید وان قوما عبدوا اللہ شکرا فتلک عبادۃ الاحرار

"ایک جماعت وہ ہے جو خدا کی عبادت کرتی ہے ثواب کی توقع میں۔ یہ تاجروں کی سی عبادت ہے اور ایک جماعت وہ ہے جو عبادت خدا سزا کے خوف سے کرتی ہے۔ یہ غلاموں کی سی عبادت ہے اور ایک قوم وہ ہے جو خدا کی عبادت کرتی ہے صرف اس کی نعمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے۔ یہ آزاد منش لوگوں

کی عبادت ہے۔"

اسی کو آپ کے بعد دوسرے آئمہ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:-

العبادة ثلاثة قوم عبدوا الله عزوجل خوفاً فتلک عبادة العبید وقوم عبدوا الله تبارک وتعالیٰ طلب الثواب فتلک عبادة الاجراء وقوم عبدوا الله عزوجل حباله فتلک عبادة الاحرار وهی افضل العبادة۔

"عبادت تین قسم کی ہوتی ہے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو خدا کی عبادت کرتے ہیں ڈر کے مارے۔ یہ غلاموں کی سی عبادت ہے۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو عبادت کرتے ہیں ثواب کی خواہش میں، یہ مزدوروں کی عبادت ہے۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو خدا کی عبادت کرتے ہیں اس کی محبت میں یہ آزاد منش لوگوں کی عبادت ہے اور وہ بہترین قسم ہے عبادت کی"

دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:-

ان الناس یعبدون الله عزوجل علیٰ ثلاثة اوجه فطبقة یعبدونه رغبة فی ثوابه فتلک عبادة

الحرصاء وهو الطمع وآخرون یعبدونه خوفاً من النار فتلک عبادة العبید وهی الرهبة ولکنی اعبده حباله عزوجل فتلک عبادة الکرام۔

"لوگ خدا کی تین طرح عبادت کرتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو خدا کی عبادت کرتا ہے ثواب کی خواہش میں، یہ لالچیوں کی سی عبادت ہے اور اس کا نام ہے طمع وحرص دوسرے لوگ وہ ہیں جو خدا کی عبادت کرتے ہیں آتش جہنم کے خوف سے۔ یہ غلاموں کی سی عبادت ہے۔ اور صرف ڈر کا نتیجہ ہے۔ لیکن میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی عبادت ہو اس کی محبت میں۔ یہ معزز لوگوں کی عبادت ہے"

بے شک اس طرح کی عبادت وہ کمال کا درجہ ہے جو صرف مقربین ہی کو حاصل ہے۔ یہی وہ ہے جس کی بنا پر امیرالمومنینؑ بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے تھے۔

مَا عَبَدْتُکَ طَمَعاً فِی جَنَّتِکَ وَلَا خَوْفاً مِنْ نَارِکَ وَلٰکِنْ وَجَدْتُکَ اَهْلاً لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ

"میں نے تیری عبادت نہیں کی تیری جنت کے لالچ یا تیری آگ کے خوف سے، لیکن میں نے تجھکو عبادت کا مستحق پایا اس لئے عبادت کی" وہاں پیش نظر صرف رضائے خدا تھی۔ اور اس لئے مناجات میں کہتے تھے کہ:- اگر تیری خوشنودی اس میں معلوم ہو کہ تو مجھے

آتش جہنم میں داخل کرے تو وہ جہنم میرے لئے جنت ہو۔"

عبادت میں اخلاص کی ضرورت

نیت میں اخلاص بہت اہم چیز ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں، کہ عبادت میں غیر خدا کسی کا لحاظ نہ ہو۔ قرآن مجید میں ہے مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ "یعنی مومنین عبادت کو خالص خدا کے لئے انجام دیتے ہیں"۔ یہاں دین سے مراد طاعت و عبادت ہے۔ جیسے نماز کو دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی حیثیت سے اس آیت میں کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ دِيْنَكُمْ "خدا تمہاری اطاعت وعبادت کو برباد نہیں کرے گا"۔ ریا وسمعہ وہ دو چیزیں ہیں جو اخلاص کے خلاف ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان عبادت کسی دوسرے شخص کو دکھانے یا سنانے کے لئے انجام دے اب ایک صورت تو یہ ہے کہ مقصود اصلی صرف دکھانا اور سنانا ہی ہو۔ اسی صورت میں وہاں للّٰہیت کا بالکل پتہ نہیں ہے مگر دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں امر ساتھ ساتھ مقصود ہوں یعنی یہ کہ اس عمل کو وہ خدا کے حکم کی بنا پر انجام دے رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ دوسرے اشخاص اس کو بہت عبادت گزار سمجھیں۔ یہ چیز بھی صحت عمل کے منافی ہے۔ عبادت میں ریاکاری ہی وہ ہے جو لسان شریعت

میں شرک خفی سے تعبیر کی گئی ہے۔ ایسے عمل کا کوئی ثواب نہیں ہوسکتا حدیث میں ہے کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے "میں بہت اچھا شریک ہوں کہ جب میرے ساتھ کسی کو شریک کر دیا جاتا ہے تو میں اپنا حصہ بھی اسی شریک ہی کو دیتا ہوں اور میں بس اس عمل کو قبول کرتا ہوں جو میرے لئے خالص ہو"

یہ ظاہر داری اور ریاکاری کا جذبہ اکثر اتنا مخفی ہوتا ہے، کہ خود انسان کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے عمل میں کوئی نفسانی غرض پوشیدہ نہیں ہے۔ مگر معمولی معمولی باتوں سے اس کے اس پندار کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ فرض کیجئے یہ نماز اگر گھر میں پڑھتا تو سرسری طور پر بہت تیزی کے ساتھ ختم کر دیتا۔ لیکن دو ایک آدمی آگئے تو اب یہ پابند ہو گیا، رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر نماز پڑھنے لگا۔ اسی سے پتہ چل جائے گا کہ اسے دکھانے کا جذبہ موجود ہے۔ کوئی شخص سامنے ہوا اس نے حروف کو مخارج سے احتیاط کے ساتھ ادا کرنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا، کہ یہ چاہتا ہے اس کی قرأت و تجوید کا مظاہرہ ہو۔ اسی طرح کی بہت ایسی صورتیں ہیں جن کی طرف اگر انسان کو توجہ ہو تو اسے اپنے عمل کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

اس کو امیرالمومنین نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ثلاث علامات للمرائی ینشط اذا رأی الناس ویکسل اذا

كان وحده ويحمد في جميع اموره

ریاکاری کی تین علامتیں ہیں - جب لوگ موجود ہوں تو اس کا عمل میں خوب دل لگے - اور جب تنہا ہو سست ہو جائے - اور وہ پسند کرتا ہو اس بات کو کہ لوگ ہر بات میں اسکی تعریف کریں نام و نمود اور مدح وثنا کی خواہش انسان کے عمل کے لیئے ایک بلائے بے زماں ہے جس سے اعمال کی زراعت بالکل برباد ہو جاتی ہے -

بیشک انسان کا مقصد صاف ہو - وہ اپنے عمل کو صرف خالصتاً لوجہ اللہ کرے - پھر اگر لوگ اس کی تعریف بھی کریں اور اسے نام بھی حاصل ہو تو یہ خدا کی نعمت ہو گی جو اس نے بندہ کو عطا فرمائی ہے اس صورت میں دنیا بھی اسکی خوشگوار ہے - اور آخرت میں بھی کامیاب ہے -

اُجرت کا مسئلہ

صحت ، عبادت اور اخلاص عمل کے گذشتہ معیار کو دیکھتے ہوئے بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی صحت میں بظاہر دشواری محسوس ہوتی ہے - روزے اور نمازیں جو میّت کی طرف سے باجرت ادا کرائی جاتی ہیں یہ ظاہر ہے کہ یہاں عمل بجا لانے والے کے لئے محرک اس کام کا وہ اجرت ہے جو اس کے لیئے معین کی گئی ہے

اس صورت میں قاعدہ ہے اس عبادت کو باطل قرار پانا چاہیئے اور جب وہ عبادت باطل ہوئی تو جس کی طرف سے وہ ادا کی گئی اس کو فائدہ کیا حاصل ہوا ؟ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو جو اعمال بجا لا رہا ہے دو حیثیتیں حاصل ہیں - ایک نائب کے شخصی لحاظ سے - اس اعتبار سے کہ یہ دوسرے کی طرف سے اعمال ادا کر رہا ہے اور اس لحاظ سے جو کام یہ کر رہا ہے وہ صرف نیابت ہے یہ وہ ہے جو براہ راست اس کی طرف منسوب ہے - دوسری وہ حیثیت ہے جو نیابت کی وجہ سے اس میں پیدا ہوتی ہے - اور اس اعتبار سے یہ گویا منوب عنہ ہے - یعنی جو عمل ہو رہا ہے وہ اس کی ذات کا نہیں ہے - بلکہ اس شخص کا ہے جس کی نیابت حاصل ہے اور وہ عمل جو منوب عنہ کی طرف منسوب ہے وہ نیابت نہیں ہے بلکہ نماز روزہ وغیرہ اس طرح کی عبادتیں ہیں -

وہ پہلا کام جو بحیثیت نائب اس سے ہوتا ہے یعنی نیابت وہ باجرت ہے - یعنی اس روپیہ کی وجہ سے وہ دوسرے کی قائم مقامی کر رہا ہے - لیکن وہ نماز و روزہ جس کو یہ بجا لاتا ہے منوب عنہ کی طرف منسوب کر کے اس کے لیئے اس کو یہ احساس ہے کہ وہ احکام خداوندی تھے جو اس منوب عنہ کے متعلق تھے اور ان احکام کے تحت میں یہ اعمال بجا لائے جا رہے ہیں - اس لیئے اس منوب عنہ کی طرف سے وہ قصد قربت جو اعمال میں ضروری ہے اس عبادت میں موجود ہے - اور

اسی لئے اس کے ثواب کا تعلق اُسی منوب عنہ کے ساتھ ہوگا یعنی نائب چونکہ باجرت نیابت کر رہا ہے اس لئے وہ اس نیابت کے ثواب کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن منوب عنہ جس کی طرف سے بقصد قربت وہ عمل ادا ہو رہا ہے وہ اس عمل کے ثواب سے بہرہ اندوز ہے۔

یہ بھی واضح ہونا ضروری ہے کہ یہ قضا کا حکم میت کی طرف سے درحقیقت ایک مستقل عبادت ہے جو خدا کی طرف سے فرزند اکبر کے ذمہ واجب قرار دی گئی ہے، یا دوسرے اشخاص کے لئے سنت ہے۔ اس سے ایک طرح کے تعاون اور باہمی مساوات کا احساس بعد فنا بھی انسان کے لئے پیدا کرانا منظور ہے۔ ورنہ وہ کوتاہی جو انسان سے زندگی میں فرائض کے ادا کرنے میں ہوئی ہے۔ اس قضاء کی وجہ سے بالکل نظر انداز ہو جانے کے قابل نہیں ہے۔ ورنہ پھر ایسے لوگ جن کی اولاد سعید ہے اس بھروسے پر کہ ہمارا فرزند ہمارے بعد نماز و روزہ ادا کرا دے گا، جان بوجھ کر اعمال و فرائض میں کوتاہی کریں یا جو لوگ دولت مند ہیں وہ زندگی بھر نماز و روزہ بجا نہ لائیں اور آخر وقت یہ وصیت کر دیں کہ ہمارے مال میں سے نماز و روزہ ادا کر دیا جائے ہرگز انہیں یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ اپنے عمل کا ہر شخص خود ذمہ دار ہے، بیشک نیک نیتی کے ساتھ اگر کوئی اپنے نماز و روزہ کے قضا کا خود ہی عزم و ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن اتفاق سے ایسا ہوا کہ موقع نہیں ملا۔ اور موت کا فرشتہ سامنے آگیا ہے۔ اس نے بمجبوری مرتے

وقت وصیت کر دی یا اولاد سے کہدیا، اس وقت خدا کے فضل و کرم سے یہ امید رکھنا چاہئے کہ وہ اس کے نیک ارادہ کی بدولت اس کو معاف کر دے اور اس سے باز پرس نہ کرے۔ مگر انسان کے لئے اپنے فرائض میں جان بوجھ کر کوتاہی ہرگز قابلِ معافی نہیں ہے اور خدا کی عدالت کے ماتحت وہ ضرور سزا کا مستحق ہے۔

دوسری چیز جو قابل لحاظ ہے وہ پیش نمازی، ذاکری، مدارس دینیہ میں تدریس ایسی چیزوں کا باجرت ادا کرنا ہے۔ جن کا تعلق فرائض دینیہ کے ساتھ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر طے شدہ ہے کہ واجبات پر اجرت لینا حرام ہے۔ جیسے کوئی شخص نماز پنجگانہ اجرت لے کر پڑھے۔ یہ اجرت ناجائز ہو گی اور مال حرام قرار پائے گی۔ اسی صورت سے واجبات کفائیہ جیسے غسالی، گور کنی اور نماز جنازہ ان تمام باتوں کو باجرت ادا کرنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر شخص پر واجب ہیں اور جو بھی انہیں انجام دے وہ ایک فرض ادا کرتا ہے۔ طبابت بھی ایسے موقع پر کہ جب حفاظت نفس کا معاملہ ہو۔ اسی میں داخل ہو جاتی ہے۔ یعنی کوئی ایسا موقع جہاں اس طبیب کی رائے میں جان کی حفاظت موقوف ہے اس امر پر کہ یہ علاج کرے وہاں اس پر علاج کرنا اس مریض کا فرض عینی ہے اور اس صورت میں معاوضہ کا کوئی سوال پیدا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ہدایت

علق اس حد تک کہ جو واجب ہے یقیناً اس پر اُجرت لینا حرام ہے
اب رہ گئے مستحبات۔ جیسے پیش نمازی، اس میں یہ ظاہر ہے کہ
یہ شخص اصل نماز پر اجرت نہیں لیتا۔ یعنی اگر یہ اجرت نہ بھی ملتی تب بھی
نماز پڑھتا۔ مگر مسجد میں اور جماعت سے نہ پڑھتا۔ یہ خصوصیات اجرت
کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیئے ان خصوصیات استحبابی کے ثواب
کا استحقاق اس کو حاصل نہیں ہے اسی طرح ذاکری، یا طبابت اس
حد تک کہ جو واجب کے درجہ تک نہ پہنچی ہو اس میں ثواب کا
استحقاق حاصل ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

مگر اس موقع پہ غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی
دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس شخص کو اس عمل کے انجام
دینے کا محرک سوائے روپیہ کے کچھ ہو ہی نہ اور کوئی تصوّر اس
کو للہیت کا پایا ہی نہ جاتا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو
للہیت کا خیال بھی ہو۔ یہ چیز ذرا آپ کو عجیب معلوم ہو گی۔ لیکن ذرا
چند لمحوں کے لئے میرے ساتھ اس مسئلہ پر غور کر لیجیئے۔

انسان بعض اوقات یہ دیکھتا ہے کہ اسے طلب معاش کے لئے
کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا تو ضروری ہے اس سلسلہ میں وہ غور کرتا
ہے۔ دیکھتا ہے کہ اگر وہ محکمۂ جور میں جا کر خدمت کرے تب بھی اسکی بسر معاش ہو جائے گی
ایک تنزانجانہ میں ملازمت کرے تب بھی بسر معاش ہو جائیگی۔ کسی دوکان کا ایجنٹ ہو اس
میں بھی بسر معاش ہو جائے گی۔ اور اس سب کے مقابلہ میں فرض

کیجئے ذاکری کو اختیار کرے، طبابت کو اختیار کرے تو یہ بھی بسر معاش کا ذریعہ
ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ پہلی ملازمت کریگا تو
ناجائز باتوں کا ارتکاب کرنا پڑیگا، دوسری صورت بھی ناجائز ہے، تیسری صورت میں بسر معاش تو ہو جائیگی
لیکن کوئی دینی فائدہ اس سے پھر بھی حاصل نہیں ہوگا۔ تیسری صورت میں وہ دیکھتا ہے کہ اس صورت میں
دینی فائدہ حاصل ہوگا۔ یا خلق خدا کو فائدہ پہنچے گا جو خداوند عالم کو مطلوب
و مقصود ہے۔ وہ اپنے بسر اوقات کے لیئے اس سلسلہ کو اختیار کرتا
ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسے پہلے پیشوں میں روپیہ زیادہ حاصل ہوتا۔ لیکن
وہ اس زیادتی سے قطع نظر کرتا ہے۔ اور اس صورت پر اپنی قلیل معشیت کے
اکتفا کرتا ہے۔ اس صورت میں وہ جو کچھ کرتا ہے بے شک پیشہ کی
صورت سے ہے مگر اس پیشہ کو اختیار کرنا اس کا خداوندی منشاء کو پیش
نظر رکھنے کی بنا پر اور دینی مفاد کے ماتحت تھا۔ اس صورت میں یقیناً
وہ جو کام انجام دیتا ہے اس پر ثواب کا بھی حقدار ہے۔ اب اس کا
دارومدار بالکل نیت پر ہو گیا۔ اور ہماری زبان بندی ہو گئی۔ یعنی ہم
کو کسی ایسے شخص کی نسبت جو اسطرح کے ذرائع کسب معاش کیلئے اختیار کرے
یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ اس کا عمل باطل ہے۔ یہ خدا ہی جانے گا کہ اس
کی نیت کیا تھی اور اس کا عمل کن جذبات و احساسات کے ماتحت ہے۔

تمام شد۔ حصّہ دوم

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور کا بلند پایہ لٹریچر

انسان کے پاکیزہ ذوق مذہبی کی بلند اور باریک چوٹیوں کو چھوتا ہوا اسکے عقلی اور علمی استدلال کی تشنگی کی تسکین کرتا ہے۔

یہ وہ صالح لٹریچر ہے جو اندھی تقلید اور مذہبی عصبیت کی ہلاکت آفریں پستی سے نکالکر حریت ضمیر اور آزادیٔ فکر کی روح پرور اور تسکین بخش بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان اپنی کھوئی ہوئی خداداد عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

آپ بھی اس تبلیغی تنظیم میں شمولیت فرما کر نصرت دین کا فریضہ ادا فرمائیں۔ چندہ رکنیت کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

سرپرست مبلغ -/۵۰۰ روپے
مربی " -/۱۰۰ "
رکن دوامی " -/۵۰ "
} انکی خدمت میں شائع ہونے والا لٹریچر ہمیشہ بلا طلب و بلا قیمت پیش ہوتا رہیگا۔

رکن خصوصی مبلغ -/۵ روپیہ سالانہ۔ انکو سال بھر میں شائع ہونیوالا لٹریچر بلا قیمت و بلا طلب ملے گا۔

رکن عمومی مبلغ -/۱ روپیہ سالانہ۔ انکو تاریخ رکنیت کے بعد سے شائع ہونیوالا لٹریچر حسب طلب نصف قیمت پر ملیگا۔ قیمت اور محصولڈاک پیشگی وصول ہونا چاہیئے۔

رابطہ قائم کرنے کا پتہ:-

سید حسن علی شاہ کاظمی سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ۔ لاہور